خانہ بدوش امریکی حسینہ

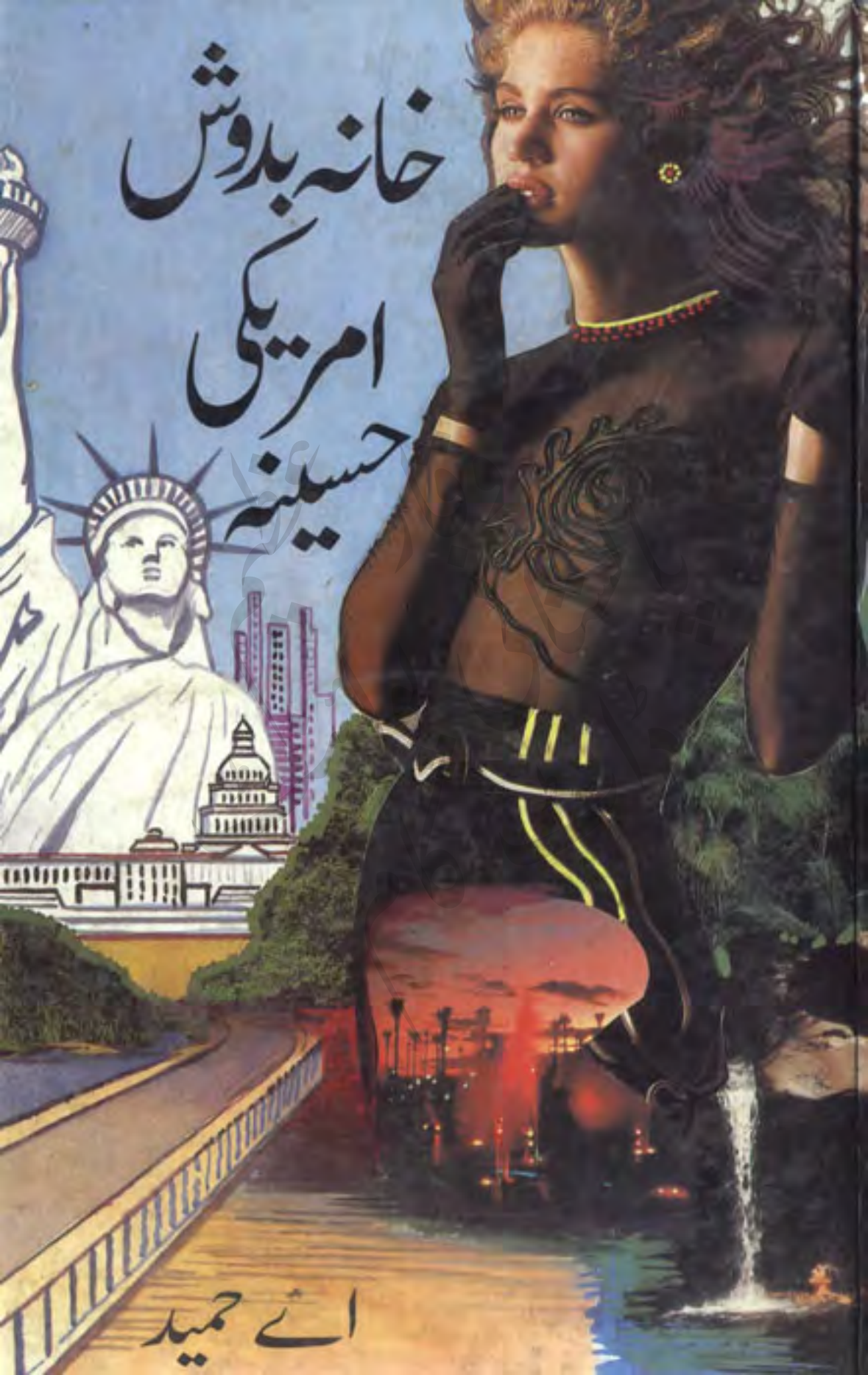

اے حمید

گارشیا نے کہا تھا میں تمہیں ملنے پاکستان ضرور آؤں گی۔

امریکہ سے واپس آنے کے بعد وہ مجھے پاکستان میں پہلی بار لاہور کے ایک ریلوے پل کے پاس نظر آئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے وہی اٹھارہویں صدی والا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ رومال تھا۔ اس نے رومال ہلایا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔ میرے کان میں اس کے ہیلو کی آواز آئی اور پھر وہ غائب ہوگئی۔ غائب اس لئے ہوگئی کہ گارشیا اٹھارہویں صدی کی ایک پراسرار روح تھی اور مجھے واشنگٹن اور نیویارک کے درمیان بالٹی مور کے ایک پرانے فرسودہ غیر آباد مکان میں پہلی بار مجسم صورت میں نظر آئی تھی۔ اس بات کو چار سال گذر گئے۔ گارشیا کو اس کے بعد میں نے لاہور میں کہیں نہ دیکھا۔ کراچی اسلام آباد بھی میرا جانا ہوا مگر گارشیا مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ اسی دوران نیویارک سے میرے دوست محمد خلیل نے خط لکھا کہ خواجہ صاحب ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔ نیویارک کا ایک چکر لگا جائیں۔ آپ سے ملے مدت گذر گئی ہے۔ خلیل کا تعلق سیالکوٹ کے ایک معزز گھرانے سے ہے اور وہ امریکہ کا گرین کارڈ ہولڈر ہے اور ایک عرصے سے نیویارک میں مقیم ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے امریکہ کے ٹیوب سٹیشنوں، سٹوروں اور کشادہ سڑکوں اور ہائی رائز بلڈنگوں اور گرتی برف کی تصویریں آگئیں اور میں نے نیویارک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ویزہ مجھے آسانی سے مل گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں

ایک بار امریکہ میں کافی مدت تک رہنے کے بعد واپس پاکستان آگیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے پاسپورٹ پر J-2 ملٹی پل ویزہ لگ چکا تھا۔

مجھے کوئی خاص تیاری نہیں کرنا تھی۔ میرے سفر ہمیشہ فانہ بدوشی کی حالت میں ہوئے ہیں۔ میں نے کبھی سامان لے کر سفر نہیں کیا۔ اگر کبھی ایک آدھ اٹیچی کیس یا بریف کیس ساتھ رکھا بھی تو اس میں سوائے ضرورت کی معمولی چیزوں کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا اور یہ اٹیچی یا بریف کیس میں جہاں اور جب چاہوں پھینک سکتا تھا۔ سامان ساتھ رکھ کر سفر کرنا مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آدمی اپنے جسم کے ساتھ پتھر یا بم باندھ کر دریا میں تیرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

جب میں پہلی بار امریکہ گیا تو اس وقت بھی میرے پاس صرف ایک چمڑے کا تھیلا تھا جسے میں نے کندھے کے ساتھ لٹکایا ہوا تھا۔ اس تھیلے میں شیو کا سامان ٹوتھ برش اور تولیہ وغیرہ تھا۔ پاسپورٹ اور ڈالر میں نے جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ دوسری بار بھی جب میں کراچی سے نیویارک جا رہا تھا تو میرے پاس وہی چمڑے کا تھیلا تھا۔ یہ تھیلا میں نے پہلی بار امریکہ جاتے ہوئے لاہور کی ایک دوکان سے خریدا تھا۔ کیونکہ پاکستان کی بنی ہوئی چمڑے کی مصنوعات کی امریکہ میں بڑی مانگ ہے۔ چمڑے کے جوتے، تھیلے اور بریف کیس اور جیکٹیں جیسی پاکستان میں خاص طور پر لاہور میں تیار ہوتی ہیں، ایسی چیزیں سارا امریکہ گھوم جائیں، کہیں نہیں ملیں گی۔ ابھی اسلام آباد اور لاہور سے نیویارک تک براہ راست فلائیٹ شروع نہیں ہوئی تھی۔ امریکہ جانے کے لئے کراچی سے جہاز میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ میں شام کی فلائیٹ سے کراچی پہنچا۔ کافی دیر تک دوستوں کے ساتھ کراچی کی سیر و سیاحت کرتا رہا۔ فلائیٹ رات کے دو بجے روانہ ہوتی تھی۔ ایک بجے میں کراچی ائیر پورٹ پر آگیا۔ میرا ٹکٹ پین ایم جہاز کا تھا۔

اب مجھے یاد نہیں کہ کیا مجبوری تھی جس کی وجہ سے مجھے اس ائیرلائن کا ٹکٹ خریدنا پڑا تھا۔ کچھ دیر گذرنے پر میں نے بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ چیکنگ کے بعد بورڈنگ کارڈ لیا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔ مسافروں میں پاکستانی بھی تھے اور گورے بھی تھے۔ میں آرام دہ کرسی پر مزے سے نیم دراز ہو کر سگریٹ پیتا رہا۔ جب فلائیٹ کی روانگی کا اعلان ہوا تو میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھا۔ پین ایم کا جہاز رن وے سے ہٹ کر کنٹرول ٹاور سے دور کھڑا تھا۔ میں جہاز کے دروازے میں داخل ہوا تو دروازے کی دونوں جانب اس قسم کی ایئر ہوسٹسس کھڑی تھی جو نہ بوڑھی تھیں، نہ جوان تھیں۔ نہ خوبصورت تھیں، نہ بدصورت تھیں۔ پہلی بار امریکہ جاتے ہوئے بھی مجھے اس قسم کا تجربہ ہو چکا تھا۔ پہلی بار چونکہ میں امریکہ کی فیڈرل گورنمنٹ کا ملازم ہونے کی حیثیت سے گیا تھا، اس لئے میرا ٹکٹ پین ایم کا بنایا گیا تھا۔ اس وقت یہ ایئر ہوسٹسس تو نہ تھیں مگر ان جیسی ہی تھیں۔ اور انہیں دیکھ کر بھی مجھے افسوس ہوا تھا کہ اٹھارہ انیس گھنٹے اب ان کی شکلیں بار بار دیکھنی پڑیں گی۔ اس بار بھی میرے ساتھ یہی ٹریجڈی ہو رہی تھی۔

یہ اس قسم کی ایئر ہوسٹسس تھیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ میرے ایسا آدمی دو تین بار ہی دیکھ سکتا تھا۔ سب کے چہروں پر نسواری تل تھے۔ ان کے قریب سے گذرا تو پرفیوم کی خوشبو بھی آئی اور مچھلی کی بو بھی آئی۔ خدا جانے وہ ابھی ابھی مچھلی کھا کر آئی تھیں۔ میں نے حسب سابق اس بار بھی کہہ کر کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ لی تھی۔ مجھے ریل گاڑی اور ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے۔ ریل گاڑی میں تو پھر بھی جنگل، دریا، کھیت، پہاڑ، شہر نظر آجاتے ہیں مگر ہوائی جہاز کی کھڑکی سے جہاز کے ٹیک آف کرنے کے کچھ دیر بعد سوائے آسمان یا بادلوں کے باہر کچھ نظر نہیں آتا۔ نیچے زمین پر کھیتوں کے دھندلے دھندلے خاکے

ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن لندن سے واشنگٹن جاتے ہوئے جہاز کی کھڑکی سے نیچے سمندر بھی ٹھیک طرح سے نظر نہیں آتا۔ پھر بھی کھڑکی کا یہ ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بدصورت مسافروں اور بوڑھی ایئرہوسٹسوں کو بار بار نہیں دیکھنا پڑتا۔

اس بار بھی میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک بڑا ہی بور قسم کا موٹا آدمی تھا جو انگریز تھا۔ جہاز نے کراچی ایئرپورٹ سے ٹیک آف کیا تو اس نے بریف کیس گھٹنوں پر رکھا۔ ایک فائل کھول کر بریف کیس پر رکھی اور بال پوائنٹ سے اس پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ میں کھڑکی کے شیشے میں سے نیچے دیکھ رہا تھا۔ نیچے کراچی شہر کی روشنیاں ستاروں کی کہکشاؤں کی مانند جھلملا رہی تھیں۔ کراچی ویسے بھی بہت خوبصورت شہر ہے اور رات کے وقت جہاز میں سے بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ میرے دل میں اس شہر کے لئے دل سے دعا نکلی کہ اے پاک پروردگار! پاکستان کے اس خوبصورت شہر کو، پاکستان کے سارے شہروں کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ اسے دشمنوں کی نظر بد سے بچانا۔

آہستہ آہستہ جہاز بلند ہوتے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ جمبو جیٹ تھا۔ یہ بلند ہوتے ہوئے ذرا دیر لگاتا ہے۔ میں مسلسل نیچے دیکھ رہا تھا۔ کراچی کی روشنیاں مجھ سے جدا ہو رہی تھیں۔ پھر یہ روشنیاں پیچھے رہ گئیں۔ کہیں کہیں کوئی روشنی ٹمٹماتی نظر آجاتی۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا انگریز فائل پر جھکا اپنے کام میں مصروف تھا۔ جہاز جب بحیرہ عرب کے اوپر پہنچا تو نیچے اندھیرا چھا گیا۔ جہاز اب کافی بلندی پر تھا۔ مجھے ٹرالی کی کھنکھناہٹ سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک ایئرہوسٹس مشروبات کی ٹرالی لئے آہستہ آہستہ آگے آ رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے ایک نظر ٹرالی پر ڈالی۔ ٹرالی پر شراب کی متنوع اقسام کی بوتلیں کھڑی تھیں۔ میری نگاہیں کسی اور شے کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں بیئر کے ٹن تلاش کر رہا تھا۔ مجھے ہینکن اور بڈوائزر کے ٹن نظر آ گئے۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے

موٹے انگریز نے سکاچ کا ایک سنگل لے لیا تھا۔ ایئرہوسٹس نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا کہ میں کیا پسند کروں گا۔ میں نے کہا:

"بڈوائزر بیئر کا ایک ٹن۔"

اس نے ٹن کھول کر ٹشو پیپر میں لپیٹ کر مجھے پکڑا دیا۔ ایئرہوسٹس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی استاد کلاس میں پہلی بار آنے والے طالب علم کو دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں، میں بے وقوف تھا جو اتنی اعلیٰ قسم کی وہسکیوں کو چھوڑ کر دو آنے والا بیئر کا ٹن لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت بیئر کے ٹن کی قیمت ہوائی جہاز میں کچھ سینٹ ہی تھی۔ مگر مجھے بیئر پسند تھی۔ اس لئے بیئر ہی طلب کی تھی۔ انگریز نے فائل بند کر دی تھی اور سکاچ پینے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے پہلی بار مجھ سے ہمکلام ہوتے ہوئے کہا:

"امریکیوں کو بیئر بنانی نہیں آتی۔ یہ یا انگریز جانتا ہے یا جرمنی والے۔"

میں نے کہا:۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ مگر بڈوائزر ساری امریکی بیئروں سے بہتر ہے۔"

انگریزوں میں ایک بات بڑی اچھی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ موٹا انگریز بھی دو تین باتیں کرنے کے بعد دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ میں نے بیئر کا دوسرا ٹن منگوا لیا۔ بیئر وغیرہ ہوتی تو شراب ہی کی ایک قسم ہے اور یہ چیزیں بالکل نہیں پینی چاہئیں اور مجھے بھی کوئی اس کی عادت نہیں تھی اور اب تو بیئر کو ہاتھ لگائے بھی سالہا سال گذر گئے ہیں مگر ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے میں بیئر ضرور پیتا ہوں۔ اس سے میرا یہ ڈر خوف دور ہو جاتا ہے کہ یہ جہاز کریش ہو گیا تو کیا ہو گا۔ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے صرف ایک ہی ڈر ہوتا ہے کہ کہیں یہ گر نہ پڑے اور مجھے یہ خوف کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

اس وقت بھی مجھ پر یہی خوف سوار تھا۔ ریل گاڑی اور سمندری جہاز میں تو آدمی ہنگامی صورت حال میں پھر بھی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا سکتا ہے لیکن ہوائی جہاز سے باہر چھلانگ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک تو اسکی کھڑکی اتنی چھوٹی ہوتی ہے اور پھر اس پر آگے پیچھے دو موٹے شیشے چڑھے ہوتے ہیں۔

خدا نہ کرے اگر جہاز نیچے گرنے لگے تو آپ کے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ جہاز میں اتنا پٹرول بھرا ہوتا ہے کہ نیچے گرتے ہی اس میں قیامت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ کئی بار دوستوں کے ساتھ لاہور سے اسلام آباد ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میرے دوست ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور میں اندر سے ڈر رہا ہوتا ہوں۔ جہاز میں ذرا سی آواز پیدا ہوتی ہے یا اس کو ہلکا سا جھٹکا لگتا ہے تو میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ اس خوف کا علاج سوائے بیئر کے میرے پاس اور کوئی نہیں۔ اور کراچی سے لندن تو آٹھ گھنٹوں کا سفر تھا۔ پورے آٹھ گھنٹے جہاز نے نہ جانے کتنے ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کرتے چلے جانا تھا۔ اس سفر میں تو بیئر کی مجھے اشد ضرورت تھی۔

حالانکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہوائی جہاز کا سفر دنیا کا محفوظ ترین سفر ہے۔ اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ جہاز کے انجن کی پرواز سے پہلے نہ جانے کتنی بار چیکنگ اور ری چیکنگ ہوتی ہے۔ اور جمبو جیٹ میں تو چار انجن لگے ہوتے ہیں۔ خدانخواستہ ایک انجن بند ہو جائے تو باقی تین جہاز کو اڑا سکتے ہیں۔ ایک پائلٹ دوست نے تو مجھے یہاں تک کہا تھا کہ اگر جہاز کے تین انجن بھی فیل ہو جائیں تو پائیلٹ ایک انجن کے ذریعے بھی جہاز کو کسی محفوظ جگہ پر اتار سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آئے دن ہوائی جہاز کریش ہوتے رہتے ہیں۔ خدا جانے یہ کس حساب میں کریش ہوتے رہتے ہیں۔

کراچی سے لندن تک میرے لئے بیئر کے تین عدد ٹن ہی کافی تھے۔ اس کے بعد میں شیر ہو گیا۔ اب میں خود موٹے انگریز سے باتیں کرنے کو بے تاب ہو رہا تھا مگر وہ آدمی سو گیا تھا۔ جہاز کی فالتو بتیاں بجھا دی گئی تھیں اور کافی مسافر اپنی اپنی سیٹوں کو لمبا کر کے سو گئے تھے۔ مگر میں تو شیر ہو گیا تھا۔ مجھے نیند کیسے آسکتی تھی۔ یہ غنیمت تھی کہ بیئر کا صرف ہلکا ہلکا سرور ہی ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کی وہ حالت نہیں ہوتی جو شراب پی کر ہوتی ہے۔ بہرحال ہے یہ بھی ام الخبائث کی بیٹی اور اس سے آدمی جتنا بچ سکے، بہتر ہے۔ جہاز کی فلائیٹ کراچی سے سیدھی دوبئی اور دوبئی سے لندن کی تھی۔ دوبئی ایئرپورٹ پر جہاز کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر ٹیک آف کر گیا۔ ہم رات کے دو بجے کراچی سے چلے تھے۔ ہمیں چلے چار پانچ گھنٹے ہو گئے تھے مگر رات کا اندھیرا اسی طرح تھا۔ سورج مشرق سے طلوع ہو چکا تھا مگر ہم سورج کے آگے آگے مغرب کی طرف بھاگ رہے تھے۔ گویا سورج کا اجالا ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔ اسی سے لندن اور پاکستان میں دن رات کے ٹائم کا فرق پیدا ہوتا ہے۔

جہاز لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔ دوبئی میں کافی پاکستانی مسافر اتر گئے تھے اور جہاز تقریباً آدھا خالی ہو گیا تھا۔ لندن سے مزید مسافر سوار ہو گئے۔ ان مسافروں میں زیادہ تر گورے تھے۔ میں نے جائزہ لیا۔ کوئی کوئی پاکستانی یا انڈین نظر آیا۔ باقی سارے مسافر امریکی یا انگریز یا یورپ کے دوسرے ملکوں کے تھے۔ اب جہاز کی فضا میں بڑی سنجیدہ خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا موٹا انگریز لندن اتر گیا تھا۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی پڑی تھی۔ جہاز میں اور بھی کئی سیٹیں خالی تھیں۔ جہاز کو لندن سے ٹیک آف کرنے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی کہ ایک سکھ ہانپتا کانپتا ہوا جہاز میں داخل ہوا۔ اس نے نسواری رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسی رنگ کی سر پر پگڑی تھی۔ ایئرہوسٹس اسے مجھ سے اگلی سیٹ دکھا کر چلی گئی۔

سردار جی نے اپنا تھیلا اوپر والے بکس میں بند کر دیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا:

"راستے میں ٹیکسی خراب ہوگئی تھی۔"

اور پھر مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ اردو میں پوچھا:

"آپ انڈین ہیں یا پاکستانی؟"

میں نے کہا:۔"میں پاکستانی ہوں۔"

سردار جی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ کھل کر ہنسنا چاہتے تھے مگر ان کی بندھی ہوئی ڈاڑھی نے اس کی اجازت نہ دی۔ مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور اردو میں ہی کہا:۔"مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آپ کراچی سے آرہے ہیں ناں"

"جی ہاں۔"

سردار جی مجھ سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ ایک دفعہ ہی نہیں بیٹھے تھے بلکہ تین بار بیٹھے تھے۔ یعنی ایک بار بیٹھے تو اٹھ کر سیٹ کو دیکھا اور بیلٹ کو سیٹ پر سے ہٹایا۔ دوسری بار بیٹھنے تو ذرا سا اٹھ کر اپنے نیچے آیا ہوا کوٹ پیچھے ہٹایا۔ اس کے بعد وہ پھیل کر بیٹھ گئے۔ جہاز نے لندن سے ٹیک آف کیا تو ایئرہوسٹس معمول کے مطابق مشروبات کی ٹرالی لے کر آگئی۔ اس نے سردار جی سے پوچھا:۔"کچھ پئیں گے سر؟"

سردار جی نے اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو ایک ہاتھ سے اوپر چڑھاتے ہوئے کہا:

"سکاچ ڈبل"

ایئرہوسٹس نے مسکراتے ہوئے ڈبل بنا کر سردار جی کو دے دیا۔ سردار جی نے ایک لمبا گھونٹ بھر کر آدھا گلاس خالی کر کے اپنے سامنے میز پر رکھ لیا اور میری طرف گردن موڑ کر بولے:

"آپ پاکستان کے کون سے شہر میں رہتے ہیں؟"

جب میں نے لاہور کا نام لیا تو سردار جی کا چہرہ کھل اٹھا فوراً زبان بدل کر پنجابی میں کہا:۔"فیر تے تسی پنجابی ہوئے ناں؟"

میں نے بھی پنجابی میں کہا:۔"جی ہاں۔ میں پنجابی ہوں۔"

اس پر سردار جی نے میرے ساتھ والی سیٹ کی طرف دیکھ کر کہا:

"یہاں کوئی بیٹھا تو نہیں ہوا؟"

میں نے مسکرا کر کہا:۔"نہیں۔"

دراصل میں خود چاہتا تھا کہ نیویارک تک پنجابی ہی میں باتیں کروں۔ سردار جی فوراً اپنی سیٹ چھوڑ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے اور لاہور کی باتیں کرنے لگے۔

"لاہور میں تو ہماری جان ہے جی۔ پاکستان سے ہمیں جتنی محبت ہے' اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں کیا بتاؤں بس آپ سمجھ لیں کہ انڈیا سے زیادہ ہمیں پاکستان سے پیار ہے۔ آپ کچھ پیتے کیوں نہیں؟"

میں اپنی بیئر کا کوٹ ختم کر چکا تھا۔ تین چار ٹن پئے تھے' وہ میں پی چکا تھا۔ مگر سردار جی پنجابی میں میرے "دوالے" ہوگئے۔ مجبوراً مجھے بیئر کا ایک فالتو ٹن منگوانا پڑا۔ اب تو خیر میں توبہ کر چکا ہوں۔ لیکن اس زمانے میں بھی میری عادت تھی کہ ایک خاص حد سے آگے بیئر کا ایک قطرہ بھی نہیں پیتا تھا۔ اب سردار جی نے میرے ہاتھ میں ٹن دے دیا تھا تو میں بادل نخواستہ کبھی کبھی ٹن کی چسکی لے لیتا تھا۔

سردار جی نے ایک ڈبل ختم کر لیا تھا اور دوسرا ڈبل پی رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ سنگل ٹریک سے خود بھی ڈبل ٹریک پر آتے جا رہے تھے۔ ان کی باتیں زیادہ بے باک اور آزاد ہوتی جا رہی تھیں۔ کہنے لگے:

"میں نیویارک میں ٹیکسی چلاتا ہوں۔"

انہوں نے جھکٹ کی جیب میں سے مجھے اپنا کارڈ نکال کر دیا۔

"فکر کی کوئی گل ہی نہیں ہے۔ آپ کو نیویارک میں جہاں جانا ہو گا' میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔ میرا یار ہرنام سنگھ ٹیکسی لے کر ایئرپورٹ پر آیا ہو گا۔ ہرنام سنگھ میرا یار بھی ہے اور چاچے کا پتر بھی ہے۔"

مجھے کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا کہ سردار جی کو ساتھ والی سیٹ پر بٹھا کر میں نے غلطی کی ہے۔ مگر میں یہ غلطی کر بیٹھا تھا۔ تیسرے ڈبل پیگ پر سردار جی نے میری طرف کندھا جھکاتے ہوئے کہا:

"نیویارک میں میری کئی گوری میمیں یار ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ میری ٹیکسی ایئرپورٹ پر ہرنام سنگھ لے کر آیا ہوا ہو گا۔ ہم وہاں سے سیدھا گوری میم کے گھر چلیں گے۔۔۔۔"

میں سردار جی کی باتوں پر کبھی ہنس دیتا۔ کبھی کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر کچھ بھی نہیں تھا۔ جہاز بحراوقیانوس کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔ بلندی اتنی زیادہ تھی کہ دن کی روشنی میں بھی نیچے سمندر ایسے نظر آ رہا تھا جیسے ریت کا صحرا ہو۔ سردار جی نے ایک ایئرہوسٹس کو بلالیا تھا اور اس کے ساتھ عجیب قسم کی انگریزی بول رہے تھے۔ انگریزی میں بھی عجیب قسم کی بولتا ہوں مگر جتنی عجیب انگریزی بلکہ غریب انگریزی سردار جی بول رہے تھے' ایسی انگریزی میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ جو زبان بول رہے تھے اس میں انگریزی کے ایک لفظ کے بعد تین لفظ پنجابی کے آجاتے تھے۔ وہ ایئرہوسٹس کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں کوئی نیا نیا امریکہ نہیں جا رہا' میں امریکہ کا گرین کارڈ ہولڈر ہوں۔ ہرنام سنگھ ایئرپورٹ پر میری ٹیکسی لے کر آیا ہو گا۔ پھر تم نے سکاچ کے ڈبل کم کیوں دیئے ہیں۔ ایئرہوسٹس بے چاری خوش اخلاقی سے سردار جی کو سمجھانا چاہ رہی تھی کہ ہمارا پیمانہ نہ زیادہ ہے نہ کم' یہ سٹینڈرڈ کا پیمانہ ہے۔ مگر سردار جی مان ہی نہیں رہے تھے۔ اتنے میں دوسری ایئرہوسٹس بھی آ گئی۔ سردار جی نے کہا:

"چلو تو پھلریک اور ڈبل دو۔"

دوسری ایئرہوسٹس نے خود سردار جی ڈبل بنا کر دیا۔ سردار جی نے گلاس کو آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا اور خوش ہو کر پنجابی انگریزی میں کہا:

"ویری گڈ۔ گل ہوئی ناں۔ آئی لائق دس۔"

ایئرہوسٹسوں نے بھی دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ جان چھوٹی۔ وہ ٹرالی لے کر آگے بڑھ گئیں۔ سردار جی اب ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔ کہنے لگے:۔

"یہ بڑی فراڈ عورتیں ہیں۔ میں ان سب کو جانتا ہوں۔ یہ ہر پیگ میں سے تھوڑی سی وہسکی بچالیتی ہیں۔ پھر جب پوری بوتل بن جاتی ہے تو اسے ایئرپورٹ پر بیچ دیتی ہیں۔"

حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ مگر سردار جی کے دماغ کی سوئی ایک جگہ آکر اڑ گئی تھی۔ مجھے بار بار کہتے:۔

"میرے ساتھ چلنا ہے گرمکھو! ہرنام سنگھ ٹیکسی لے کر آیا ہو گا۔ میری اپنی ٹیکسی ہے' ہرنام سنگھ کی نہیں ہے۔ میں گرین کارڈ ہولڈر ہوں۔ ہرنام سنگھ نہیں ہے۔ وہ تو میرا ملازم ہے۔ چاہتا میں اس کی بہن سے شادی کر لوں۔ مگر میں اسکی بہن سے شادی کر کے ان کے سارے ٹبر کو امریکہ نہیں بلا سکتا۔۔۔ ہاں اگر یہ "لو میری" ہوتی تو اور بات تھی۔"

لو میری سے سردار جی کا مطلب لو میرج تھا' یا لوافیئر تھا۔ جہاز میں جو سکرین لگی تھی' اس پر کوئی انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی جو دوسری جنگ عظیم کے بارے میں

تھی۔ اس کی آواز نہیں تھی۔ صرف خاموش فلم چل رہی تھی۔ آواز صرف ان کو آ رہی تھی جنہوں نے کچھ پیسے کر ہیڈ فون لے لئے ہوئے تھے اور کانوں سے لگائے خاموش فلم کی آواز بھی سن رہے تھے۔ میں کسی وقت سکرین پر چلتے فلم کے خاموش مناظر دیکھنے لگتا۔ سردار جی کو اب کافی چڑھ گئی تھی مگر چونکہ ایک مدت سے امریکہ میں رہ رہے تھے' اس لئے ان میں کم از کم یہ احساس ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ آدمی چاہے جتنی پی جائے اسے آؤٹ نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ وہ گرتے گرتے آؤٹ ہوتے ہوتے سنبھل کر بیٹھ جاتے تھے۔

اس دوران مجھے باتھ روم جانا پڑ گیا۔

میں نے دیکھا کہ جہاز میں کافی سیٹیں خالی تھیں۔ چنانچہ باتھ روم سے نکلنے کے بعد میں پیچھے ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ درمیانی قطار کی سیٹیں تھیں جو ساری کی ساری خالی تھیں۔ کوئی ایک گھنٹہ میں وہاں بیٹھا رہا۔ اس دوران دور سے سردار جی کو کبھی کبھی دیکھ لیتا۔ وہ کبھی مجھے' کبھی ایئر ہوسٹس کو بلا کر اس سے باتیں کرتے اور کبھی اپنی پگڑی ٹھیک کرتے نظر آتے۔ ایک بار میری نظر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اس نے کسی اور مسافر کو میری سیٹ پر بٹھالیا ہوا تھا اور اس سے ہاتھ منہ چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔ میں وہاں بیٹھے جب تھک گیا تو اپنی سیٹ کی طرف چلا۔ میری سیٹ پر دوسرا آدمی بیٹھا تھا' وہ بھی کوئی انڈین ہندو تھا۔ مجھے دیکھ کر سردار جی نے اس سے کہا:

"بادشاہو ہن تسی جاؤ۔ ساڈا بندہ آ گیا اے۔"

میں سیٹ پر بیٹھا تو سردار جی نے حیران ہو کر مجھ سے پوچھا:

"تسی کدھر سیل کر ن چلے گئے سو؟"

میں نے کہہ دیا:۔

"پیچھے دو تین سیٹیں خالی تھیں' وہاں تھوڑی دیر کے لئے سو گیا تھا۔"

سردار جی کا نشہ کافی اتر چکا تھا۔ کہنے لگے:

"میں حیران و پریشا کہ میرے واگھورو جی ہمارا لاہوری یار کہاں چلا گیا ہے۔ بس اب نیویارک پہنچے ہی سمجھو۔"

مگر ابھی نیویارک نکافی ور تھا۔ سردار جی مجھ سے باتیں کرنے لگے:

"تسیں پہلی دفعہ امریکہ آئے ہو۔ رات کو ہارلم کے علاقے میں اکیلے مت جانا' وہاں کالے لوٹ لیتے ہیں۔ جاؤ تو ایک چاقو ضرور ساتھ رکھ لینا۔ یا پھر پستول رکھ لینا۔ امریکہ میں اسلحہ عام مل جاتا ہے۔ کوئی فکر دی گل نئیں۔ میں تمہیں پستول دے دوں گا۔ ہرنام سنگھ گاڑی لے کر آئے گا تو اس سے پستول لے کر دے دوں گا۔ ہرنام ہر وقت پستول اپنے پاس رکھتا ہے۔۔۔ ہرنام سنگھ ٹیکسی لے کر ضرور آئے گا۔ آخر میری ٹیکسی ہے۔ اس کے پیو دی ٹیکسی نئیں۔۔۔۔"

ابھی سکاچ وہسکی کے چار پانچ ڈبل پیگ کا اثر باقی تھا۔ یہ بھی سکاچ وہسکی تھی جس نے سردار جی کو زیادہ خراب نہیں ہونے دیا تھا۔ ورنہ اگر دیسی ہوتی اور سردار جی اپنے ملک میں ہوتے تو اب تک سردار جی کا سر کھل چکا ہوتا۔ بلکہ کئی لوگوں کے سر کھل چکے ہوتے۔ لندن سے نیویارک تک نو دس گھنٹوں کا سفر تھا۔ میں کھڑکی کے شیشے سے جب بھی باہر یا نیچے دیکھتا تو مجھے معلوم ہوتا کہ جہاز اپنی جگہ پر رک گیا ہے۔ صرف اس کی مشینری اور انجن چل رہے ہیں' جہاز خود آگے نہیں بڑھ رہا۔ کیونکہ باہر اور نیچے کوئی شے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی شے نظر آتی اور وہ پیچھے کی طرف جاتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ جہاز آگے جا رہا ہے۔ یہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی جھٹکی تشریح تھی۔

کراچی سے چلنے کے بعد کچھ معلوم نہیں تھا کہ کب اور کہاں سورج غروب ہوا۔ کہاں رات ہوئی اور کہاں دن چڑھا۔ اور کل کیا تاریخ تھی اور آج کیا تاریخ تھی۔ تاریخ

بدل گئی تھی۔ ٹائم بدل گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد جغرافیہ بھی بدلنے والا تھا۔ سورج جہاز کے نیچی غروب ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں نیچے دور سفید بادلوں کے ٹکڑے غروب ہوتے سورج کی روشنی میں سرخ ہو رہے تھے۔ کہیں کوئی بادل بھی نظر آتے تو جہاز دیر تک اس کے آس پاس ہی رہتا۔ حالانکہ وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کے باہر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ جب باہر کچھ نظر ہی نہ آتا تھا تو پھر دیکھنا بیکار تھا۔

جہاز میں کھانا بھی ملا۔ سہ پہر کی چائے بھی ملی۔ اس دوران میں نے دو بار کافی بھی منگوائی۔ پھر باہر آسمان پر اندھیرا چھا گیا۔ تارے نظر آنے لگے۔ پھر بالکل ہی اندھیرا چھا گیا۔ میں کھڑکی کے شیشے کی طرف دیکھتا تو مجھے اپنا اور اپنے پیچھے سردار جی کا چہرہ نظر آتا۔ میں جلدی سے سر پیچھے کر لیتا۔ سردار جی سو گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رات کے کوئی دس گیارہ بج رہے تھے کہ نیچے کہیں کہیں نظر آنے والی ٹمٹماتی روشنیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت تک سردار جی ہوش میں آ چکے تھے۔ کھڑکی میں سے نیچے دیکھ کر بولے:

"بادشاہو! امریکہ آ گیا جے۔"

امریکہ کے آنے سے پہلے اس کی روشنیاں اتنی دیر تک نظر آتی رہیں کہ معلوم ہوتا تھا امریکہ کبھی نہیں آئے گا۔ میں ان روشنیوں سے شناسا تھا۔ ان روشنیوں کو ابھی دو اڑھائی گھنٹے تک نظر آتے رہنا تھا۔ بہرحال میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم بحر اوقیانوس عبور کر آئے تھے اور شمال مشرقی امریکہ کا ساحل شروع ہو گیا تھا۔ دو اڑھائی گھنٹے کے بعد نیچے نیویارک کی مضافاتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ اتنی زیادہ روشنیاں تھیں کہ لگتا تھا نیچے آسمان کے سارے ستارے ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔

سردار جی ان روشنیوں کو میری کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے:

"بس اب نیویارک آنے والا ہے، ہرنام سنگھ گاڑی لے کر آیا ہو گا۔"

پھر میرا کندھا پکڑ کر بولے:

"بادشاہو! تسیں میرے ساتھ چلنا۔ میں آپ جی کو پہلے آپ کے فلیٹ پر چھوڑ کر پھر اپنے فلیٹ پر جاؤں گا۔ آپ جی کا فلیٹ کس علاقے میں ہے؟"

میں نے سردار جی سے کہا:

"تھرٹی فسٹ سٹریٹ میں ہے۔"

سردار جی نے جھوم کر کہا:

"بادشاہو! گل ای کوئی نئیں۔ میں تھرٹی فور سٹریٹ میں رہتا ہوں۔ بس اکٹھے ہی ایئر پورٹ سے چلیں گے۔"

آخر نیویارک کی روشنیاں شروع ہو گئیں۔ روشنیاں کیا تھیں، رنگ نور کا سیلاب تھا۔ دور نیچے سڑکوں پر گاڑیوں کی روشنیاں دریا کی طرح بہہ رہی تھیں۔ ایک دریا اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک دریا نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ امریکہ کے لوگ ٹیکنالوجی میں کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے۔ جمبو جیٹ طیارہ اتنی آہستگی کے ساتھ بلندی کم کرتا جا رہا تھا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ صرف نیچے کی روشنیاں صاف اور واضح ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ جہاز میں کچھ ہندوستانی اور دو چار پاکستانی بھی تھے۔ انہوں نے بالکل اسی طرح سامان نکال نکال کر اپنی اپنی سیٹوں پر رکھنا شروع کر دیا تھا جس طرح ہمارے ہاں ریل گاڑی میں لاہور قریب آتا دیکھ کر مسافر برتھ پر سے سامان اتارنا شروع کر دیتے ہیں۔ یورپین اور امریکی مسافر بڑے سکون سے اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

اتنے میں سپیکر پر ایئر ہوسٹس کی سریلی آواز ابھری:

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! اپنی اپنی بیلٹ باندھ لیں۔ سگریٹ بجھا دیں۔ ہم جے ایف کینیڈی ایئر پورٹ پر چند لمحوں میں اترنے والے ہیں۔ شکریہ!"

اب معلوم ہوا کہ جہاز نیچے اتر رہا ہے کیونکہ نیچے کی روشنیاں بڑی تیزی سے اوپر آرہی تھیں۔ یہ منظر پہلے بھی نیویارک جاتے ہوئے میں نے بڑے شوق سے دیکھا تھا اور اب بھی بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں کھڑکی کے شیشے سے پیچھے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ نیویارک کا جگ مگ کرتا مجسمہ آزادی آیا اور گھوم کر دائیں طرف کو نکل گیا۔ پھر دریائے ہڈسن کی جھلملاتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں' جہاز اب کافی نیچے آچکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ روشنیاں جو جہاز کے نیچے سے گذرتی دکھائی دیتی تھیں' جہاز کے متوازی ہوگئیں۔ جہاز ایئرپورٹ پر اتر آیا تھا۔ چھ سات سیکنڈ بعد جہاز کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ جہاز کے پچھلے پہیوں نے رن وے کو چھوا تھا۔ جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جہاز راستے میں سمندر میں نہیں گرا اور میں خیریت سے نیویارک پہنچ گیا ہوں۔ سردار جی اس دوران پگڑی کھول کر دوبارہ باندھ چکے تھے۔ میں نے اوپر والے خانے سے اپنا تھیلا اتار کر کاندھے پر ڈالا تو سردار جی بولے:

"بھاجی! میرے ساتھ رہنا۔ ہرنام سنگھ گاڑی لے کر آگیا ہوگا۔ میری اپنی گاڑی ہے۔ آپ جی کو ٹیکسی لینے کی ضرورت نہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ میرا دوست محمد خلیل بھی ایئرپورٹ پر اپنی گاڑی لے کر پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے پہلی بار سردار جی سے کہا:

"آپ کا شکریہ سردار جی! مگر میرا دوست بھی گاڑی لے کر آگیا ہوگا۔"

سردار جی بولے:

"بادشاہو! وہ آپ کا دوست ہے تو ہم بھی آپ کے یار ہیں۔ آپ جی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ ہرنام سنگھ تو گاڑی لے کر آیا ہی ہوگا۔۔۔"

میرا خیال تھا کہ میں اتنے بڑے نیویارک کے ایئرپورٹ پر ہجوم میں سردار جی سے کہیں نہ کہیں الگ ہوجاؤں گا۔ مگر کچھ ایسا حساب بن گیا کہ میں سردار جی سے اور

سردار جی مجھ سے الگ نہ ہوسکے۔ کسٹم کاؤنٹر پر بھی ہم اکٹھے ہی تھے۔ پھر ارائیول لاؤنج سے پہلے رولنگ بیلٹ کے پاس بھی ہم ساتھ ساتھ تھے۔ میرا سامان تو میرے پاس تھا مگر سردار جی کا اٹیچی کیس رولنگ بیلٹ پر چلا آرہا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں کھڑے تھے اور مجھے بھی بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ ان کا اٹیچی کیس آیا تو سردار جی نے اسے لپک کر اٹھالیا اور میرے ساتھ ہی ارائیونگ لاؤنج میں آگئے۔ اب وہ ہرنام سنگھ کو تلاش کرنے لگے اور میری آنکھیں اپنے دوست محمد خلیل کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ گیٹ کے باہر دوسرے لوگوں میں مجھے خلیل کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آگیا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلایا تو سردار جی بولے:

"کیا ہرنام سنگھ آگیا ہے؟"

میں نے کہا:۔ "نہیں میرا دوست آگیا ہوا ہے۔ میں جاتا ہوں۔ پھر ملاقات ہوگی۔"

سردار مجھے دیکھتے رہ گئے اور میں خلیل کی طرف لپکا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گلے لگ کر ملے۔ وہ بولا:

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا:۔ "خدا کا شکر ہے جہاز خیریت سے ہی پہنچ گیا۔"

وہ ہنس کر بولا:۔

"واقعی خدا کا بہت شکر ہے۔"

اور ہم دونوں ہنستے باتیں کرتے ایئرپورٹ کی پہلی منزل کو جانے والے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ جب ہم گیٹ سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ سردار جی ایک طرف کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ان کا ہرنام سنگھ شاید گاڑی لے کر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ سردار جی کو بھی اسی طرف جانا ہے' جس طرف ہم جارہے ہیں۔ انہیں

ساتھ لے لیتے ہیں۔ بے چارے پریشان ہو رہے ہیں۔ میں نے خلیل سے بات کی تو وہ بولا:

"بالکل کوئی حرج نہیں' کہاں ہیں سردار جی؟"

ہم گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکال کر باہر گیٹ کے پاس لے آئے۔ سردار جی نے مجھے دیکھا تو ہاتھ ہلایا۔ میں گاڑی ان کے پاس لے آیا۔

"سردار جی! اگر ہرنام سنگھ نہیں آیا تو کوئی بات نہیں' آجائیں۔ ہم آپ کو فلیٹ پر چھوڑ دیں گے۔"

سردار جی ہرنام سنگھ کو گالیاں دیتے ہمارے گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ تھرٹی فرسٹ سٹریٹ تک سارا رستہ سردار جی ہرنام سنگھ کو گالیاں دیتے رہے۔

"گاڑی میری ہے تو پھر وہ کیوں نہیں آیا؟"

محمد خلیل نے کہا:۔

"ہو سکتا ہے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ آپ اس فلائیٹ پر آرہے ہیں۔"

سردار جی نے ہرنام سنگھ کو بڑی زبردست گالی دی:

"میں نے ٹیلی گرام دیا تھا۔ فون پر بھی اسے فلائیٹ کا نمبر اور ٹائم بتایا تھا۔ پھر کیوں نہیں آیا؟ بس ذرا وہ میرے سامنے آجائے۔ اس کی....."

ہم نے سردار جی کو تھرٹی فور سٹریٹ میں اتار دیا۔ سردار جی بہت مشکور ہو رہے تھے۔ کہنے لگے:

"یار مجھے فون ضرور کرنا۔ تمہارے پاس میرا کارڈ موجود ہے۔ ملاقات ضرور ہونی چاہئے۔"

میں نے کہا:۔ "ضرور ضرور۔"

اور ہماری گاڑی وہاں سے ایک سڑک کی طرف گھومنے کے بعد تھرٹی فسٹ سٹریٹ میں داخل ہو گئی۔

خلیل کا ڈبل بیڈ روم کا فلیٹ تھا' جسے اس نے بڑی خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ آرام و آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ میں جہاز کے طویل سفر سے تھکا ہوا تھا۔ پانچ دس منٹ خلیل سے پاکستان اور لاہور کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں سو گیا۔ دوسرے دن خلیل کو چھٹی تھی۔ وہ ایک بہت بڑے شاپنگ سنٹر کے سٹور میں کام کرتا تھا۔ میں دن کے گیارہ بجے تک سویا رہا۔ خلیل اس دوران کھانا وغیرہ تیار کر چکا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم کافی کے مگ لے کر بیٹھ گئے۔ خلیل کہنے لگا:

"اب تم آئے ہو تو کم از کم ویزے کی مدت تک یہاں ضرور رہنا۔ واشنگٹن بھی چلیں گے اور اس بار کیلی فورنیا کی بھی سیر کریں گے۔"

نیویارک میں اس سے پہلے بھی آچکا تھا۔ جیسا اسے چھوڑ گیا تھا' ویسے ہی تھا۔ میرے اندر بالٹی مور جانے کی بے چینی لگی ہوئی تھی جہاں مجھے پرانے مکان میں گارشیا کی روح سے ملاقات کی توقع تھی۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ گارشیا نے ابھی تک مجھے اپنا آپ نہیں دکھایا تھا۔ جبکہ لاہور کے ریلوے پل پر وہ بے دھڑک میرے سامنے ظاہر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے دوست خلیل سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں کوئی بات کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

جو کہانی مجھے گارشیا کی روح نے پچھلی بار سنائی تھی' وہ یہ تھی کہ اس سے زندگی میں کوئی گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ اور وہ اس کی سزا اس طرح بھگت رہی تھی کہ اس کی روح

زمین پر بھٹکتی پھرتی تھی۔ جس شکستہ مکان میں وہ آسیب بن کر رہ رہی تھی' اسی مکان میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اس کا بائیس برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا:

"اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو مجھے اس عذاب سے نجات مل سکتی ہے۔ کیونکہ شادی کرنے کے بعد میں اپنے گناہوں کا نیک کام کر کے ازالہ کر سکوں گی۔ پھر میری روح بدروح بن کر بھٹکتی نہیں پھرے گی۔"

میں نے یونہی ایڈونچر کے طور پر اس سے شادی کی حامی بھر لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ تو ایک روح ہے اور روحوں کی شادیاں کہاں ہوتی ہیں۔ مگر جب گارشیا نے کہا کہ وہ میرے حامی بھرنے کے بعد انسانی جسم میں ظاہر ہو جائے گی تو میں گھبرا گیا۔ کیونکہ میں شادی شدہ تھا اور گارشیا کی روح یا بدروح سے شادی کرنے کے بعد کئی قسم کے سنگین مسائل کھڑے ہو سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے گارشیا سے کبھی نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا اور اس سے ملے بغیر امریکہ سے پاکستان آ گیا۔ گارشیا کی روح یقیناً مجھ سے ناراض تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوبارہ مجھ سے نہیں ملی تھی۔ لاہور کے ریلوے پل پر بھی وہ صرف ایک دفعہ میرے سامنے ظاہر ہوئی اور دور سے ہاتھ ہلا کر غائب ہو گئی۔

میں محض ایڈونچر کے لئے اس کے بالٹی مور کے قریبی ویران مکان میں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے روحوں اور بدروحوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے اور ان سے مل کر موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شروع ہی سے شوق رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی روح نے آج تک مجھے موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہر ایک روح یہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی کہ:۔

"یہ راز خداوندی ہے' اس کو ظاہر کرنے کی ہم کبھی جرات نہیں کر سکتیں۔"

دو دن میں اپنے دوست کے ہاں نیویارک میں رہا۔ ڈانس کلبوں میں جا کر عریاں اور نیم عریاں عورتوں کے ڈانس دیکھے۔ واہیات فلمیں دیکھیں۔ اچھی کلاسیکل فلمیں بھی دیکھیں۔ سنجیدہ اور کلاسیکل قسم کے ریستورانوں میں بیٹھ کر نیویارک کی بارش کا نظارہ بھی کیا۔ اصل میں ان دنوں میرے اندر گناہ اور ثواب کی کشمکش جاری تھی۔ میرے اندر برائی اور اچھائی کی جنگ ہو رہی تھی۔ آپ سے میں کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ کبھی میں برا آدمی بن جاتا تھا۔ کبھی اچھا آدمی بن جاتا تھا۔ کبھی عریاں ڈانس اچھے لگتے تھے۔ کبھی عریانیت کا خیال آتے ہی میں توبہ استغفار کرنے لگتا تھا۔ یہ سمندر کی طوفانی لہروں اور ساحل پر کھڑی چٹانوں کی جنگ تھی۔

سمندر کی بپھری ہوئی موجیں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ کبھی چٹان کے پاؤں لڑکھڑا جاتے تھے اور کبھی چٹان لوہے کی دیوار کی طرح اپنی جگہ پر کھڑی رہتی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سیدھی راہ پر قائم رکھا۔ اور مجھے نیکی بدی کی اس جنگ میں سرخ رو کیا۔ میں آپ کو دل پر ہاتھ رکھ کر سچ بتاتا ہوں کہ اب چائے کی ٹی کوزی میں پانچ منٹ تک دم کی ہوئی چائے کی گولڈن پیالی میں وہ خوشبوئیں اور وہ کیفیتیں اور وہ جنگل' پھول اور بارشوں کے منظر ہیں کہ دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترین شرابیں اور عریاں رقص کے ہیجان خیز منظر اس کے سامنے گرد بن کر اڑ جاتے ہیں۔ اب یہ میرے ذوق کا تقاضا بن چکا ہے۔ میں جنگلوں کی جن بارشوں' پھولوں بھری وادیوں' سیب اور ناشپاتی کے پھلوں سے لدے درختوں اور ویران جزیروں کے ساحلوں پر جھومتے ناریل کے درختوں کی تلاش میں بھٹک کر شراب خانوں کی طرف نکل گیا تھا۔ آخر وہ شراب خانوں سے نکال کر اپنے پاس لے گئے تھے۔ میرا عشق سچا تھا۔ میں بچ گیا۔ خدا نے مجھے سچے عشق کی توفیق عطا کی تھی۔ اسی نے مجھے بچا لیا۔ میں دلدل سے نکل آیا تھا۔ اس لئے آپ کو بتا سکتا ہوں کہ یہ جو سامنے زمین پر اگی ہوئی سرسبز گھاس اور پھولوں

پھولوں کی کیاریاں نظر آرہی ہیں' آپ اس طرف نہ جائیں' اس کے نیچے ہلاکت خیز دلدل ہے۔ اپ میری بات کو سچ تسلیم کریں۔ یہاں میں ایک بار پھر پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں سے کہوں گا کہ وہ بے شک گھٹنوں سے ادھڑی ہوئی جینز پہنیں۔ بے شک بالوں کی گت رکھ کر گٹار بجاکر ڈانس کریں۔ مگر اپنے ذہن کو غلیظ خیالات سے ہمیشہ پاک رکھیں۔ غلط خیال شیطان دماغ میں ڈالتا ہے۔ صاجب کردار وہ نوجوان ہے جو اس غلط خیال کو اپنے کردار کی طاقت سے دماغ سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔ شراب' بیئر اور سگریٹ وغیرہ کے نزدیک بھی نہ جائیں۔ یہ چیزیں شروع میں بڑی خوشگوار لگتی ہیں مگر کچھ عرصہ گذر جانے پر یہ سانپ بن کر آدمی کے کردار کو ڈسنا شروع کردیتی ہیں۔ ان سے ہر ممکن طریقے سے بچیں۔ یہ میری نصیحت نہیں ہے' یہ آپ کی ضرورت ہے۔

جن دنوں کی میں بات کر رہا تھا' ان دنوں میں سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا تھا۔ ابھی مجھے چائے کے گولڈن افق پر حسن و جمال کا چاند طلوع ہوتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ کیا چائے کا بھی کوئی گولڈن افق ہوتا ہے؟

چائے کا ذکر آتے ہی میں اکثر جذباتی ہو جاتا ہوں۔ کاش! میں اس وقت جنوب مشرقی ایشیا کے کسی جنگل میں کنول کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی کسی جھیل کے کنارے بانس کے کاٹج میں بیٹھا ہوتا اور میرے سامنے نیلے پھولوں والی چائے دانی میں کاشان کی پہاڑی ڈھلانوں پر اگنے والی چائے دم کی ہوئی ہوتی۔ میں چائے کی روشنی پیالی میں انڈیلتا اور ہلکی ہلکی بارش شروع ہو جاتی۔۔۔ میرا خیال ہے مجھے اس موضوع کو یہیں ختم کر دینا چاہئے۔ میرا مطلب ہے اسے کسی دوسرے ناول یا افسانے کے لئے اٹھا رکھنا چاہئے۔ ابھی تو مجھے صرف بڈوائزر بیئر میں ہی روشنی نظر آتی تھی۔ دو دن نیویارک میں رہنے کے بعد میں نے اپنے دوست سے کہا:

"خلیل بھائی! واشنگٹن میں میرے کچھ دوست ہیں۔ سوچتا ہوں ان سے مل آؤں۔"

"ضرور مل آؤ۔ واشنگٹن یہاں سے کونسا اتنی دور ہے۔ کیا میں تمہارے ساتھ چلوں؟"

میں نے کہا:۔ "نہیں بھائی۔ تمہارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے امریکہ میں کافی وقت گذارا ہے۔ میرے لئے یہاں کا تمدن اور لوگ کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا اور دو ایک دن وہاں رہ کر واپس آجاؤں گا۔"

"تو پھر وہاں اپنے دوستوں کو ٹیلی فون پر اطلاع کر دو۔"

"اسکی بھی ضرورت نہیں۔ میں اچانک ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش اور حیران ہوں گے۔۔۔ یہی میں چاہتا ہوں۔"

خلیل نے کہا:۔ "جیسے تمہارے مرضی۔ کب جانے کا پروگرام ہے؟"

"میرا خیال ہے کل صبح کی گاڑی سے نکل جاؤں گا۔"

دوسرے روز میں نے ایم ٹریک ٹرین نیویارک کے ریلوے سٹیشن سے پکڑی اور بالٹی مور کے سٹیشن پر اتر گیا۔ میں نے ٹکٹ بھی بالٹی مور کا ہی لیا تھا۔ بالٹی مور سے پندرہ میل آگے وہ غیر آباد مکان تھا جہاں مجھے پہلی بار گارشیا کی روح ملی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہاں پہلی بار اس نے مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنائی تھی کہ وہ کیوں اس طرح بھٹکتی پھر رہی ہے۔

بالٹی مور سے میں ٹیکسی لے کر ویران قصبے کے قریب ہی سڑک پر اتر گیا۔ یہاں سے آگے سمندر کی کھاڑی کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ سمندر کی کھاڑی کے مغربی ساحل کے پاس وہ بے آباد ٹوٹے پھوٹے مکانوں والا ویران قصبہ تھا جس کے ایک مکان میں گارشیا کی روح آسیب بن کر رہ رہی تھی۔ مجھے اسکا مکان تلاش کرنے میں کوئی دقت

پیش نہ آئی۔ تباہ حال شکستہ مکان سمندری ہواؤں کی وجہ سے کچھ مزید تباہ حال ہو چکا تھا۔ پہلے چھت پر جو چند ایک لکڑی کے تختے باقی نظر آتے تھے اب وہ بھی اکھڑ چکے تھے۔ میں مکان کے سامنے جاکر کچھ دیر کے لئے کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ کسی مکان کا کھنڈر تھا۔ آس پاس کے لوگوں کو معلوم تھا کہ اسی مکان میں کسی عورت کی بدروح رہتی ہے اور رات کو اس کی چیخوں کی آواز آتی ہے۔ چنانچہ ادھر سے کبھی کوئی نہیں گذرتا تھا۔ میں مکان کے برآمدے میں سے گذر کر اندر کمرے میں آگیا۔ ٹوٹی ہوئی چھت میں سے کہیں کہیں آسمان نظر آرہا تھا۔ کونوں میں اسی طرح جالے لٹک رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے فرنیچر پر جمی ہوئی گرد میں اضافہ ہو گیا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ گارشیا کی روح اس وقت وہاں موجود ہوگی اور مجھے دیکھ رہی ہوگی اور مجھ سے ضرور ہمکلام ہوگی اور مجھ سے گلہ کرے گی کہ میں اسے بتائے بغیر اس سے وعدہ خلافی کر کے کیوں چلا گیا۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔

مکان کے تین چار چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن کے لکڑی کے اکھڑے ہوئے فرش میرے چلنے سے چڑ چڑا رہے تھے۔ ہر کمرے میں مٹی اور جالے لگے تھے۔ سوائے ٹوٹی پھوٹی دو چار کرسیوں اور ایک پرانے صوفے کے وہاں اور کچھ نہیں تھا۔ صوفے اور کرسیوں کی بناوٹ ڈیڑھ سو سال پرانی تھی۔ ان کا کپڑا خستہ ہو کر مٹی بن چکا تھا۔ ان پر کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں مکان کے عقبی برآمدے میں آگیا۔ یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

برآمدے کے فرش کے تختے کئی جگہوں سے غائب تھے۔ یہاں کونے میں ایک چھوٹی کوٹھڑی تھی۔ پرانا سٹور روم ہوگا۔ اسی سٹور روم میں مجھے گارشیا نے کہا تھا کہ میں رہتی ہوں۔ سٹور روم کے دروازے کا ایک پٹ غائب تھا۔ میں نے اندر جھانک

کر دیکھا۔ اندر آسیبی خاموشی اور اندھیرا تھا۔ میں نے آہستہ سے گارشیا کو آواز دی۔ اس کا نام لے کر اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے دوسری بار آواز دی۔

"گارشیا! میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ آئی ایم سوری!"

اس پر بھی جب وہاں خاموشی چھائی رہی تو میں نے خیال کیا کہ گارشیا کی روح یہاں پر نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی دوسری جگہ چلی گئی ہے۔ مگر دل نہیں مانتا تھا۔ کیونکہ گارشیا نے ایک بار مجھے خود کہا تھا کہ یہ ہمارا پرانا مکان ہے۔ میں نے اسی گھر کے ایک کمرے میں انتقال کیا تھا۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں کچھ دیر کے لئے برآمدے کے ستون کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے سگریٹ نکال کر سلگالیا۔

یہ امریکی سگریٹ تھا۔ امریکی سگریٹ دس بارہ سال پہلے بڑے کمال کے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب کیمیاوی کھادوں نے ان کے تمباکو کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ پہلے ورجینیا کے تمباکو میں جو ایک خاص تلخ قسم کی خوشبو ہوا کرتی تھی وہ اب غائب ہو چکی تھی۔ پہلے ہر امریکی سگریٹ کا ذائقہ الگ ہوتا تھا۔ مگر اب سب امریکی سگریٹ ایک جیسے ہو گئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کوئی لائیٹ تھا اور کوئی سٹرانگ۔ مگر سب کا تمباکو جلا ہوا تھا اور ایک ہی طرح کا ذائقہ تھا۔ بلکہ ذائقہ تھا ہی نہیں۔ جن لوگوں نے آج سے پندرہ بیس برس پہلے کا امریکی لکی سٹرائیک سگریٹ پیا ہے وہ میری بات کی تائید ضرور کریں گے۔

میں برآمدے میں چپ چاپ بیٹھ سگریٹ پی رہا تھا اور پرانے امریکی سگرٹوں کو یاد کر رہا تھا۔ بالٹی مور کا آسمان نیلا تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہ موسم بہار کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد بارشوں اور پھر تیز سرد ہواؤں کا موسم شروع ہونے والا تھا جب امریکہ کے درختوں سے پتے گرتے ہیں۔ سگریٹ ابھی ختم نہیں ہوا تھا مگر میں اس سے بیزار ہو گیا تھا۔ میں نے سگریٹ کو دور پھینک دیا۔ برآمدے سے یہ سوچ کر اٹھا

کہ واپس چلنا چاہئے۔ گارشیا کی روح نے مجھے معاف نہیں کیا اور اب وہ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے گی۔

شکستہ مکان کے صدر دروازے کی طرف جانے کے لئے مجھے درمیانی کمروں کی تنگ سی راہ داری میں سے گذرنا پڑا۔ میں راہ داری میں آیا تو مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کہ میں نے گارشیا کی روح میں ہی دیکھی تھی کہ اس کے چلنے سے اس کے قدموں کی آواز آتی تھی۔ ورنہ روح کے چلنے کی آواز نہیں ہوا کرتی۔ میں وہیں رک گیا۔ گارشیا کی روح مجھ سے ملنے آگئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کو آواز دی۔

"گارشیا! میں تم سے معافی مانگتا ہوں، میں مجبور ہو گیا تھا۔ آئی ایم سوری!"

امریکی معاشرے میں جب کوئی آئی ایم سوری کہتا ہے تو وہ دل سے معذرت طلب کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی فعل پر دل سے نادم ہے۔ اگرچہ میرا انداز بھی منافقانہ تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ گارشیا میرے منافقانہ مزاج سے اچھی طرح واقف ہے اور میری کمزوریوں کو درگذر کر دے گی۔ میں راہ داری میں کھڑا تھا۔ قدموں کی آہٹ کی آواز صدر دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ جب میرے تین چار مرتبہ آواز دینے پر بھی گارشیا نے کوئی جواب نہ دیا تو میں مایوس ہو گیا۔ قدموں کی آواز ایک بار پھر آئی۔ آواز صدر دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے مکان کے سامنے والے دروازے میں آیا تو ایک موٹی امریکی عورت کو دیکھا جو برآمدے میں کھڑکی نما مکان کی ایک کھڑکی کا تختہ اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اسے ہیلو کہا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں مجھے خوف سا جھلکتا نظر آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس مکان کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں۔ میں نے اسے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"میڈم! پریشان نہ ہوں۔ میں کوئی بدروح نہیں ہوں۔ میں ایک ٹورسٹ ہوں۔ اس مکان کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہ کوئی پرانا تاریخی مکان ہے۔ بس اس کو دیکھنے یہاں آگیا تھا۔ آؤ میں تختہ اکھاڑنے میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔"

امریکی عورت دیہاتی ٹائپ کی تھی۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور یہ کہہ کر بڑبڑاتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر چلی گئی۔

"تم اس وقت کہاں سے ٹپک پڑے ہو؟"

جب وہ عورت چلی گئی تو میں نے گارشیا کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے گارشیا کہ تم یہاں نہیں ہو۔ ورنہ تم کبھی اس عورت کو اپنے مکان کو مزید تباہ کرنے کی اجازت نہ دیتیں۔"

اس بار بھی گارشیا کی روح کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اب مجھے بالکل شک نہ رہا کہ کوئی روح یہاں پر موجود ہے۔ میں مکان سے نکل کر سڑک کے پٹرول پمپ کی طرف چلنے لگا۔ وہاں سے مجھے بالٹی مور جانے کے لئے ٹیکسی وغیرہ مل سکتی تھی۔ پٹرول پمپ خالی پڑا تھا۔ میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر کسی ٹیکسی کو دیکھنے لگا۔ نیویارک سے بالٹی مور تک نیویارک کی ٹیکسیاں نہیں چلتیں بلکہ لیموزین گاڑیاں چلتی ہیں لیکن اسے عرف عام میں ٹیکسی ہی کہا جاتا ہے۔ لیموزین گاڑیوں کو بطور ٹیکسی چلانے کے لئے خاص لائسنس لینا پڑتا ہے۔ یہ ہائی وے سڑک نہیں تھی۔ بلکہ بالٹی مور سے واشنگٹن اور نیویارک جانے والی ہائی وے کی ایک ذیلی سڑک تھی۔ یہاں بھی گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ مگر مجھے کوئی لیموزین گاڑی نظر نہ آئی۔ اصل میں یہ گاڑیاں بالٹی مور تک آتی تھیں۔ میں پندرہ میل دور ایک ویران سے قصبے کی سڑک پر کھڑا تھا۔

ایک گاڑی جو واشنگٹن کی طرف سے آرہی تھی' پٹرول پمپ پر آکر رک گئی۔ یہ ذیلی سڑک ہائی وے سے نکل کر ایک نیم دائرے کی شکل بناتی ہوئی بالٹی مور سے ہوکر دوبارہ ہائی وے میں جاکر مل جاتی تھی۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا اور ٹہلنے لگا تھا۔ جو گاڑی ابھی آکر رکی تھی' اس میں سے ایک آدمی باہر نکل کر ٹینکی میں پٹرول ڈالنے لگا۔ وہ شکل و شباہت سے انڈین یا پاکستانی لگتا تھا۔ اس نے بھی مجھے ایک دو بار غور سے دیکھا تھا۔ جب وہ ٹینکی بھر چکا تو کاؤنٹر پر جاکر بل ادا کیا اور میرے پاس چل کر آگیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

"آر یو فرام انڈیا؟"

میں نے اردو میں کہا:۔

"جی نہیں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

اس نے خوش ہوکر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں بھی پاکستانی ہوں۔ میرا نام سلطان ہے۔ اگر تم نیویارک جارہے ہو تو میں تمہیں لفٹ دے سکتا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔۔۔ میں بھی نیویارک جارہا ہوں۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔۔۔ میں نے کہا:

"تھینک یو۔ مجھے بھی نیویارک ہی جانا ہے۔"

میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی نئے ماڈل کی بڑی قیمتی گاڑی تھی۔ مجھے ماڈل کا نام یاد نہیں رہا۔ گاڑیوں کے ماڈل مجھے اکثر یاد نہیں رہتے۔ البتہ جو لڑکیاں یعنی امریکی لڑکیاں ماڈلنگ کرتی ہیں' ان کے نام مجھے فوراً یاد ہوجاتے تھے۔ گاڑی میں آسائش کی ہر شے موجود تھی۔ ڈیک لگا ہوا تھا۔ سنٹرلی ہیٹرڈ تھی۔ سلطان صاحب نے مجھے بتایا کہ پچھلی سیٹوں کے درمیان بٹن دبانے سے ایک ٹیبل کاؤنٹر باہر نکل آتا ہے جس پر رکھ کر آپ مشروبات سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ اس کے انجن کی آواز بالکل نہیں آتی تھی۔

سڑک تھوڑی شکستہ تھی۔ مگر کوئی ہلکا سا جھٹکا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ امریکہ میں رہ کر اتنا مجھے علم ہوچکا تھا کہ ایسی گاڑی کوئی امیر آدمی ہی اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یقیناً یہ آدمی جس کا نام سلطان ہے' کوئی بہت بڑا کاروبار کررہا ہوگا۔ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا:

"میں واشنگٹن میں ایک چھوٹا سا ریستوران چلاتا ہوں۔ پاکستان سے آئے دس پندرہ سال ہوگئے ہیں۔ میں نے گرین کارڈ بھی حاصل کرلیا ہے۔ اکیلا رہتا ہوں۔ شادی نہیں کی۔ آپ نیویارک میں کیا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا:۔ "میں تو محض امریکہ کی سیر کرنے ٹورسٹ ویزے پر آیا ہوں۔ نیویارک میں اپنے دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہاں بالٹی مور کا سمندر دیکھنے آگیا تھا۔"

سلطان نے ڈیش بورڈ میں سے سنہری سگریٹ کیس نکال کر ایک ہی ہاتھ سے بٹن دباکر اسے کھولا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا:۔ "سگریٹ پیئں گے؟"

میں نے شکریہ کہتے ہوئے سگریٹ اٹھالیا۔ یہ امریکی سگریٹ نہیں تھا۔ سلطان کا ایک بازو سٹیئرنگ وہیل پر تھا۔ اس نے سگریٹ کیس کے ساتھ ہی لگے ہوئے لائیٹر کو جلاکر میرا سگریٹ سلگایا اور سگریٹ کیس واپس ڈیش بورڈ میں رکھتے ہوئے بولا:

"میں گاڑی چلاتے ہوئے سگریٹ نہیں پیا کرتا۔ اس طرح آدمی کا خیال ادھر ادھر ہوجاتا ہے۔ امریکہ میں گاڑی چلانا بڑی ذمے داری کا کام ہے۔"

میں نے سگریٹ کا کش لگایا تو کچھ حیران ہوا۔ سگریٹ کا ذائقہ بہت اچھا تھا۔ میں نے سگریٹ پر لکھا ہوا نام پڑھنے لگا تو سلطان نے کہا:

"یہ ٹرکش سگریٹ ہے۔ مجھے امریکی تمباکو بالکل پسند نہیں۔ میں ہمیشہ ٹرکش سگریٹ پیتا ہوں۔ استنبول سے میرا ایک دوست مجھے ہر ماہ دو بار کارٹن بھیج دیتا ہے۔ کیا تمہیں پسند آیا؟"

میں نے کہا:۔ "بہت پسند آیا ہے۔"

سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا:۔ "اگر کبھی واشنگٹن آنا ہو تو مجھے ضرور ملنا۔ میں تمہیں ایک کارٹن بطور تحفہ پیش کروں گا۔"

میں دل میں سوچنے لگا کہ یہ ایک معمولی ریستوران کا مالک ہے۔ پھر اس کے پاس اتنی قیمتی گاڑی کہاں سے آگئی اور یہ سگریٹ بھی استنبول سے منگوا کر پیتا ہے۔ پھر میں نے یہ سوچ کر یہ خیال دل سے نکال دیا کہ مجھے کیا۔۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی سائیڈ بزنس ہو۔ گاڑی اب ہائی وے پر آگئی تھی اور اپنی لین میں نیویارک کی طرف ہوا سے باتیں کرتی اڑی چلی جا رہی تھی۔

سلطان کہنے لگا:

"میں ایک ضروری کام سے نیویارک جا رہا ہوں۔ مگر شام کو میں فارغ ہوتا ہوں۔ اگر تمہارے پاس وقت ہو تو ہم دونوں شام اکٹھے گذاریں گے۔ تم میرے پاکستانی بھائی ہو۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

اس نے مجھے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر دیا۔ کہنے لگا:

"یہ میرے واشنگٹن کا ایڈریس ہے۔ ٹیلی فون نمبر بھی ہے۔ واشنگٹن آنا ہوا تو مجھے ضرور کال کرنا۔ میں تمہیں ایئرپورٹ پر یا سٹیشن پر گاڑی بھجوا دوں گا۔"

سلطان سے مل کر مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی تھی۔ پردیس اور خاص کر سات سمندر پار امریکہ میں جب کسی پاکستانی سے ملاقات ہوتی ہے تو بہت ہی خوشی ہوتی ہے۔ اپنے وطن کی خوشبوئیں آنے لگتی ہیں۔ اسکی عمر کوئی زیادہ نہیں تھی۔ جوان آدمی تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ کہنے لگا:

"میں آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ شادی کے جنجال میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ یہاں عورتیں شادی کے بغیر ہی گھر میں آکر رہ لیتی ہیں۔ یہاں کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ پھر مجھے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے اپنی شادی پر افسوس ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ باتوں باتوں میں ہم نیویارک پہنچ گئے۔ سلطان نے مجھے نیویارک میں اپنے دوست کا فون نمبر بھی دے دیا۔

"اگر چاہو تو شام کو مجھے فون کر کے آجانا۔ مزے کی شام گذاریں گے۔ مدت بعد میرے وطن کا آدمی ملا ہے۔ لاہور' کراچی کی باتیں کریں گے۔"

میں نے کہا:۔ "میں ضرور فون کروں گا۔"

"بس یہی کوئی چار پانچ بجے فون کر لینا۔ میں فون کا انتظار کروں گا۔"

وہ مجھے تھرٹی فسٹ سٹریٹ کے کونے پر اتار کر آگے چل دیا۔ سلطان کی گاڑی اتنی آرام دہ تھی کہ جب میں اس میں سے باہر نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں فسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ سے نکل کر تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آگیا ہوں۔ میں فلیٹ میں گیا تو میرا دوست خلیل فلیٹ پر نہیں تھا۔ وہ سٹور پر جہاں کام کرتا تھا' گیا ہوا تھا۔ مگر نیچے رینٹل آفس والوں کو بتا گیا تھا کہ اگر میں آؤں تو مجھے چابی دے دی جائے۔ میں چابی لے کر فلیٹ میں آگیا۔ اکیلا سگریٹ سلگا کر اور ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا۔ ذہن سلطان کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ ایک یہ شخص ہے کہ امریکہ میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک میں ہوں کہ اگر امریکہ میں ویزے کی مدت کے بعد ایک گھنٹہ بھی ٹھہرنا چاہوں تو نہیں ٹھہر سکتا۔ فرض کریں اگر مجھے یہاں ایک سال ٹھہرنے کی بھی اجازت مل جاتی ہے تو میں سوائے چھوٹی موٹی نوکری کرنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ اور امریکہ میں بڑی نوکریوں میں کچھ نہیں بچتا' چھوٹی موٹی نوکری میں کیا بچے گا۔ میں ان لوگوں کی حالت دیکھ چکا تھا جو پٹرول پمپوں پر یا سٹوروں میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ ایک بیڈ روم کے فلیٹ میں چھ چھ سات سات مل کر رہتے تھے۔ صوفوں پر اور فرش پر سوتے تھے۔ کوئی رات کی ڈیوٹی کر کے آکر سو جاتا تھا' کوئی دن کو منہ ہاتھ

دھو کر آنکھوں میں نیند کا خمار لئے ڈیوٹی دینے نکل جاتا تھا۔ امریکہ میں ڈیوٹی پوری سختی سے لی جاتی ہے۔ اگر آپ کی ڈیوٹی کسی بینک کے کاریڈار میں گارڈ کی ہے تو آپ کو آٹھ گھنٹے کاریڈار میں ادھر ادھر ٹہل کر گذارنے پڑیں گے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ کسی جگہ دم بھرنے کے لئے بیٹھ جائیں۔ اس کے باوجود مہینے کے آخر میں ایک ڈالر بھی نہیں بچتا تھا۔ جن لوگوں کی پیچھے فیملیاں تھیں' وہ راتوں کو اوور ٹائم لگاتے تھے یا دو دو نوکریاں کرتے تھے اور ہر وقت ان کی آنکھوں میں نیند بھری رہتی تھی۔ ان کی نیندیں پوری نہیں ہوتی تھیں۔ اور پھر کہیں جا کر وہ اپنے گھر پیچھے مہینے کے سو دو سو ڈالر بھیجتے تھے۔

میں نے امریکہ میں چار پانچ سال رہ کر دیکھ لیا تھا۔ مگر اس وقت میری نوکری سرکاری تھی۔ میں تھوڑے بہت ڈالر بچا لیا کرتا تھا۔ لیکن وہ نوکری ختم ہو چکی تھی۔ اب اگر میں امریکہ میں رہنا چاہوں تو لامحالہ مجھے یا کسی پٹرول پمپ پر روزانہ آٹھ گھنٹے سردی گرمی برفباری میں کھڑے ہو کر گاڑیوں میں پٹرول ڈالنا پڑے گا یا اگر وہاں خود کار مشین لگی ہے تو مجھے مشین کے پاس کھڑے ہو کر چیک کرنا پڑے گا کہ پٹرول اتنا ہی بھرا جائے جتنے پیسے گاہک نے دیئے ہیں۔ یا پھر میں کسی شاپنگ سٹور میں چیزوں کے بکس سارا دن ادھر سے اٹھا کر ادھر کرتا رہوں گا یا کسی ریستوران کا فرش صاف کرنے کی نوکری مل جائے گی۔ اگر میں بی اے پاس ہوں تو اپنے گھر ہوں گا۔ امریکہ میں اس کی کسی کو پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ بی اے کو کچھ سمجھتے ہی نہیں کہ یہ کیا بلا ہوتی ہے۔

امریکہ میں کچھ مدت گذارنے کے بعد میں اس ملک میں عیش و عشرت اور دولت کی فراوانی کو دیکھ چکا تھا۔ چونکہ میرا مزاج بھی عیش پسند تھا' اسی لئے سلطان کی باتوں سے اور اس کو دیکھ کر میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی سلطان کی طرح امریکہ میں زندگی بسر کر سکتا۔ میرے پاس بھی مرسیڈیز ایئر کنڈیشنر گاڑی ہوتی

اور میں بھی گھٹیا امریکی تمباکو پیتے رہنے کی بجائے استنبول سے ٹرکش سگریٹ منگوا کر پیتا۔ مجھے رہ رہ کر سلطان کی زندگی پر رشک آرہا تھا۔ ریفریجریٹر سے میں نے تھوڑا سا فاسٹ فوڈ نکال کر کھالیا۔ ٹی وی دیکھتے جب شام کے چار بجے کا وقت ہوا تو میں نے سلطان کا نمبر نکال کر انہیں فون کیا۔ دوسری طرف سے سلطان نے ہی ریسیور اٹھایا۔ میں نے انگریزی میں کہا:

"مجھے مسٹر سلطان سے بات کرنی ہے۔"

وہ بولا:۔ "میں سلطان ہی بول رہا ہوں۔"

میں نے اسے خدا جانے کیوں اپنا اصلی نام نہیں بتایا تھا۔ میں نے کہا:۔

"جی ہاں۔ میں سلمان بول رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم تھا تم ضرور فون کرو گے' اب ایسا ہے کہ میں یہاں ڈاؤن ٹاؤن میں ہوں۔ تم تھرٹی فسٹ سٹریٹ سے ٹیوب پکڑ کر فورٹیینتھ سٹریٹ کے سب وے سٹیشن پر آجاؤ۔ میں وہاں موجود ہوں گا۔ اوکے؟۔"

"اوکے" میں نے کہا۔ "میں آرہا ہوں۔"

میں نے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی پھیری۔ ٹائی کی ناٹ درست کی اور فلیٹ کو تالا لگا کر نیچے لابی میں آیا۔ چابی رینٹل آفس والوں کو دی اور تھرٹی فرسٹ سٹریٹ کے ٹیوب سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میں نیویارک کے سارے ٹیوب سٹیشنوں سے واقف تھا۔ ٹیوب میں بیٹھا اور فورٹیینتھ سٹریٹ کے سٹیشن پر اتر کر الوؤں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

امریکی عورتیں اور مرد تیز تیز قدم اٹھاتے بڑے نظم و ضبط کے ساتھ باہر جارہے تھے۔ میں ایکسیلیٹر پر چڑھ کر اوپر آیا تو خدا خدا کر کے سامنے سلطان صاحب کی شکل نظر آئی۔ وہ مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ جیسے ہم برسوں کے دوست ہوں۔

"خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

اور وہ خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

سٹیشن کے باہر پارکنگ لاٹ میں اس کی قیمتی آرام دہ گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر پارکنگ لاٹ سے نکلے تو سلطان نے مجھ سے پوچھا:

"تم کہاں جانا پسند کرو گے؟"

میں نے کہا:۔ "کسی ریستوران میں چل کر کافی پیتے ہیں۔"

سلطان ہنسا۔ کہنے لگا:

"یار اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ ہم لوگوں کی دوڑ یہیں تک ہوتی ہے۔ میں تمہیں کافی بھی پلاؤں گا مگر ایک ایسی جگہ لے جاکر جو تمہیں بہت پسند آئے گی۔ وہاں پینے کے لئے کافی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو گا۔"

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گاڑی نیویارک کے لوگوں سے بھرے ہوئے بازاروں اور بلند و بالا بلڈنگوں کے درمیان سے گذر رہی تھی۔ ہم دریائے ہڈسن کے پل پر سے بھی گذر گئے۔ پھر شہر کے باہر کا خوبصورت پارکوں والا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ علاقہ ختم ہوا تو ایک طرف درختوں کے جھنڈ دکھائی دینے لگے۔ یہ دریائے ہڈسن کے شمال مشرقی کنارے کا علاقہ تھا اور یہاں بڑے امیر لوگوں کے بنگلے تھے۔ یہاں ہائی رائیز بلڈنگ کوئی نہیں تھی۔ میں اس خیال سے سلطان سے کچھ نہیں پوچھ رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے گنوار نہ سمجھ بیٹھے۔

گاڑی ایک خوشنما پارک کے درمیان بنی ہوئی سڑک پر سے گذر کر ایک پرانی طرز کے مگر نہایت خوبصورت امریکی بنگلے کے لان میں داخل ہو گئی۔ لان میں ہر طرف گول دائروں والی کیاریوں میں موسمی پھول کھلے ہوئے تھے۔ بنگلے کے ایک جانب چار چمکیلی

گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بنگلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سلطان نے بھی ایک طرف اپنی گاڑی کھڑی کر دی۔

میں نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا:

"یہ کس کا بنگلہ ہے؟"

سلطان نے مسکراتے ہوئے مجھے ہلکی سی آنکھ ماری اور کہا:

"ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ پیارے یہ امریکہ ہے۔ لوگ امریکہ ضرور آتے ہیں مگر امریکہ اپنا آپ کسی کسی کو دکھاتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ چند سیکنڈ بعد ایک نوجوان نیگرو لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ سلطان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ لڑکی نے خادماؤں والی سفید فرگی ہوئی نیلی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ دونوں کا آپس میں ہائے ہائے ہوا۔ وہ دروازے سے پیچھے ہٹ گئی۔ سلطان نے میری طرف دیکھ کر کہا:

"کم اون مائی فرینڈ۔"

ہم ایک سفید اور سیاہ ٹائیلوں والی راہ داری سے گذر کر ایک کشادہ ہال میں آ گئے جس کی چھت پر ستونوں کے درمیان فانوس لٹک رہا تھا۔ سلطان نے نیگرو خادمہ سے انگریزی میں پوچھا:

"میڈم گلوریا کونسے کمرے میں ہوں گی؟"

خادمہ نے کہا:

"وہ نیچے کولڈ روم میں ہیں۔"

سلطان ایک اونچے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ بڑے دروازے سے ذرا پہلے بائیں جانب ایک چھوٹا محراب دار دروازہ تھا۔ سلطان نے اسے کھولا۔ سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ سیڑھیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔

چھ سات سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک روشن روشن تنگ سی راہ داری آ گئی۔ آگے پھر ایک دروازہ آ گیا جو بند تھا۔ باہر ایک باڈی بلڈر ٹائپ کا نیگرو کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا دھڑا دھڑ چیونگ گم چبا رہا تھا۔ اس کی بیلٹ کے ساتھ پستول لگا ہوا تھا۔ سلطان کو دیکھ کر وہ مسکرایا:

"ہائے سلطان! ہاؤ یو ڈوئنگ ٹوڈے؟"

سلطان نے کہا:

"فائن، یہ میرا گیسٹ ہے، میں نے میڈم گلوریا کو فون پر بتا دیا تھا۔"

"اوکے۔ نو پرابلم بڈی۔۔۔"

اور نیگرو گارڈ نے مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو، تشریف لے جائیں۔ وہاں دروازے کے پیچھے سے فاسٹ میوزک کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ سلطان نے دروازہ کھولا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا۔

اندر اندھیرا تھا مگر روشنیوں کے گول دائرے چاروں طرف گھوم رہے تھے اور ڈیک پر مائیکل جیکسن کا کوئی تیز ردھم والا گانا بج رہا تھا۔ اس دھندلی روشنی اور دھندلے اندھیرے والے ماحول میں مجھے چھ سات لڑکیاں اور لڑکے میوزک کی تیز دھن پر دیوانہ وار ناچتے نظر آئے۔ فضا سگریٹ اور شراب کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ میں اس قسم کی فضا کا عادی تھا اور یہ اب مجھے کچھ کچھ مانوس لگنی لگی تھی۔ پہلے تو مجھے اندھیرا اندھیرا سا لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ہر شے نظر آنے لگی مگر دھندلی دھندلی، جیسے خواب میں چیزیں نظر آتی ہیں۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ شیلف میں قسم قسم کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ آگے کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں اور مرد کاؤنٹر کے پاس کھڑے اپنی اپنی پسند کے مشروب

پی رہے تھے۔ لگتا تھا سبھی بہکے ہوئے ہیں۔ ہم بھی کاؤنٹر کے ایک جانب جاکر کھڑے ہوگئے۔ سلطان نے مجھ سے پوچھا:

"تم کیا پینا پسند کرو گے؟"

میں نے کہا:۔ "بیئر۔"

سلطان ہنس کر کہنے لگا:

"بیئر تو یہاں گھوڑے پیتے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا:

"مجھے بھی گھوڑا ہی سمجھ لیں۔"

☆☆☆

عورتوں، مردوں کا وحشیانہ رقص جاری تھا۔ فضا سگریٹ کے دھوئیں، مختلف پرفیومز کی خوشبوؤں اور الکوحل کی بو سے آلودہ ہورہی تھی۔ سلطان نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"چلو تمہیں مس گلوریا سے ملاتا ہوں۔ وہ اس کلب کی مالک ہے۔ بڑی اچھی خاتون ہے۔"

مس گلوریا ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کیبن میں صوفے پر دونوں بازو پھیلائے بیٹھی تھی۔ کیبن کی آدھی دیواریں شیشے کی تھیں جہاں سے عورتوں کے رقص کا منظر نظر آرہا تھا مگر موسیقی کی تیز آواز کافی دب گئی تھی۔ مس گلوریا کی عمر جوانی کی سرحد عبور کرچکی تھی مگر جسم تندرست اور توانا تھا۔ کھلے گریبان والا پھولدار فراک پہنے ہوئے تھی۔ سلطان کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بازو کھول دیئے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر رخساروں پر بوسے دیئے اور میرا تعارف کرایا کہ یہ بڑا ہونہار نوجوان ہے۔ اس کو تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ میں سلطان کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ میں نے مس گلوریا سے ملنے کا کبھی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔

سلطان نے مجھے آنکھ مار کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مس گلوریا نے بہت زیادہ میک اپ کیا ہوا تھا اور وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ سامنے میز پر گلاس میں اس کا مشروب پڑا تھا۔ میری طرف تیز نظروں سے دیکھ کر کہا:

"کیا تم پہلی بار امریکہ آئے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے پہلے کچھ عرصہ امریکہ میں رہ چکا ہوں۔ اس پر سلطان نے مس گلوریا سے کہا:

"لیکن اس نے اصلی امریکہ نہیں دیکھا تھا' اس لئے میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ یہ میرا ہم وطن بھی ہے۔"

مس گلوریا نے مسکراتے ہوئے کہا:

"تو پھر اسے کہو ڈائس پر جاکر رقص کرے۔"

سلطان بولا:

"یہ شرمیلا لڑکا ہے۔ اس کے لئے کوئی شرمیلی لڑکی تلاش کرنی پڑے گی۔"

مس گلوریا نے قہقہہ لگاکر کہا:

"تو پھر اسے میرے ساتھ ڈانس کرنا چاہئے' میں بڑی شرمیلی لڑکی ہوں"

سلطان مس گلوریا کے پاس بیٹھ کر اس سے رازداری کے انداز میں باتیں کرنے لگا۔ میں کیبن کے شیشوں میں سے رقص کرتے جوڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس قسم کے رقص وغیرہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں رہے تھے۔ میں اس سے پہلے ڈانس کلبوں میں یہ رقص دیکھ چکا تھا۔ مگر تھوڑی دیر گذرنے پر یہاں ایک نئی بات دیکھی۔

کیبن میں باہر کے میوزک کی دبی دبی آواز آرہی تھی۔ اچانک میوزک بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی روشنیوں کے دائرے بھی بجھ گئے۔ ڈانس روم میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ عورتوں کے قہقہوں اور چیخوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں مس گلوریا کی دائیں جانب والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ مجھے اسکا سایہ سا نظر آرہا تھا۔ سلطان اٹھ کر ڈانس روم میں جاچکا تھا۔ مس گلوریا نے مجھے بازو سے کھینچ کر اپنی طرف کرلیا اور ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی:

"تم سچ مچ شرمیلے ہو یا لڑکیوں پر اثر جمانے کے لئے شرمیلے بنتے ہو؟"

میں شرمسار سا ہوکر مسکراتا رہا۔ مس گلوریا میرے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لے آئی۔ مجھے اس کے میک اپ کی کریم اور شراب اور سگریٹ کی بو آرہی تھی۔ کہنے لگی:

"مجھے تم اچھے لگے ہو۔ لیکن تمہیں اپنی شرم دور کرنی ہوگی۔ جاؤ۔ ڈانس روم میں جاؤ۔ اس وقت وہاں شرم نام کی کوئی چیز تمہیں نظر نہیں آئے گی۔۔"

اس نے مجھے دروازے کیطرف دھکیلا۔ میں خود بھی اس عورت کے پاس نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ جلدی سے کیبن کا دروازہ کھول کر ڈانس روم میں آگیا۔ اگرچہ وہاں گھپ اندھیرا تھا مگر انسانوں کے ہیولے دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ وہاں اب اور ہی طرح کا شور مچا ہوا تھا اور قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اچانک ساز بجنے لگے۔ پھر ایکدم سے روشنیوں کے دائرے روشن ہوگئے۔ عورتیں اور مرد دوبارہ ساز کی دھن پر رقص کرنے لگے۔ سلطان کو میں نے کونے میں ایک لڑکی سے باتیں کرتے دیکھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ میں قریب گیا تو اس نے اس لڑکی سے بھی میرا تعارف کرایا۔ خدا جانے اس کا کیا نام تھا۔ اب تو مجھے اس کی شکل بھی یاد نہیں رہی۔

کوئی دو گھنٹے ہم نے اس ڈانس روم میں گذارے۔

پھر مس گلوریا سے رخصت ہوکر بنگلے سے باہر نکل آئے۔ باہر رات ہو چکی تھی۔ سلطان نے اپنی خوبصورت کار کا انجن سٹارٹ کرتے ہوئے کہا:

"سلمان! تم میرے ہم وطن بھی ہو اور اب میں تمہیں اپنا دوست بھی سمجھنے لگا ہوں۔ اگر تم اپنی قسمت بنانا چاہتے ہو تو مجھے واشنگٹن آکر ملو۔ بہت ممکن ہے کہ پھر تمہارے پاس بھی میری طرح کی قیمتی کار ہوگی اور تمہارا اپنا عالی شان فلیٹ ہوگا۔"

میں اس شخص سے ضرور متاثر ہوا تھا اور میرے دل میں اپنی قسمت بنانے اور امریکہ میں رہ کر ڈالر کمانے کی خواہش بیدار ہو چکی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ بلکہ اپنے حساب سے کافی عرصہ پہلے بھی امریکہ میں رہ کر دیکھ لیا تھا۔ میں ایک ڈالر بھی نہ بچا سکا تھا۔ جو کماتا تھا، وہیں خرچ ہو جاتا تھا۔ اور پھر بھی تنگی ترشی میں گذارا ہوتا تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ڈالر کما کر وطن واپس جاؤں۔ پاکستان میں ڈالر کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ میری بھی خواہش تھی کہ سلطان کی طرح میں بھی قیمتی کار میں نیویارک، واشنگٹن کی سڑکوں پر پھروں اور ڈانس کلبوں میں میری بھی دوست عورتیں ہوں۔ مگر یہ سب کچھ دولت کے بل بوتے پر ہی ہو سکتا تھا اور میرے ہم وطن سلطان نے مجھے دولت کمانے کا گرین سگنل دے دیا تھا۔

رات کو میں اپنے دوست خلیل کے فلیٹ پر آیا تو وہ یہی سمجھا کہ میں واشنگٹن گیا تھا، وہاں سے واپس آیا ہوں۔ میں نے بھی یہی ظاہر کیا اور سلطان سے ملاقات اور ڈانس کلب کا بالکل ذکر نہ کیا۔ اب میرا پروگرام واشنگٹن جا کر سلطان سے ملاقات کرنے کا تھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سلطان کے پاس کس قسم کا پروگرام ہے جس پر عمل کرتے ہوئے میں بھی امریکہ میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکتا تھا اور پاکستان میں اپنے گھر بھی زیادہ سے زیادہ ڈالر بھیج سکتا تھا بلکہ گلبرگ اور ڈیفنس میں پلاٹ خرید کر اپنی کوٹھی بھی شروع کرا سکتا تھا۔

میرے اندر ایک نیا جوش ابھر آیا تھا۔ یہ جوش ہوش کے بغیر تھا۔ دولت کمانے کا جوش بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہوتی ہے کہ آدمی کسی ایسے خزانے کو کھودنا شروع کرے جس پر سانپ بیٹھا پہرہ دے رہا ہو۔ مگر اس وقت میری عقل میرا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ میں نے دو دن کا وقفہ ڈال دیا۔ تیسرے دن خلیل سے کہا:

"یار مجھے پھر واشنگٹن جانا پڑ گیا ہے۔ کل جب تم کام پر گئے ہوئے تھے کہ میرے دوست سلیم کا فون آیا تھا کہ تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔ واشنگٹن کا ایک اور چکر لگا جاؤ۔"

سادہ دل خلیل کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ میں کس چکر میں پھنسنے والا ہوں بلکہ پھنس چکا ہوں۔ کہنے لگا:

"ٹھیک ہے تو پھر چکر لگا آؤ۔"

میرے پاس بس اتنے ہی ڈالر تھے جس سے بمشکل ایک مہینہ کرایوں وغیرہ پر خرچ کر سکتا تھا۔ رہتا تو میں خلیل کے پاس ہی تھا لیکن اوپر کا خرچ مجھے اپنے پاس سے ہی کرنا ہوتا تھا۔ اور کرنا بھی چاہئے تھا۔ امریکہ میں آپ کسی کے ہاں زیادہ دیر بطور مہمان نہیں ٹھہر سکتے۔ وہاں کی اکانومی ایسی ہے کہ ہر آدمی کا مہینے کا خرچ نپا تلا ہوتا ہے۔ کسی جاب کرنے والے کے پاس فالتو ایک ڈالر بھی نہیں ہوتا۔ میں ٹرین میں سوار ہو کر واشنگٹن روانہ ہو گیا۔

چلنے سے پہلے میں نے سلطان کو ٹیلی فون پر بتا دیا تھا کہ میں فلاں گاڑی سے آ رہا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ میرا ڈرائیور انڈین ہے اور اسکا نام موہن لعل ہے۔ بوڑھا آدمی ہے۔ ٹرین واشنگٹن کی طرف اڑی جا رہی تھی اور میں اس سوچ میں گم تھا کہ سلطان کے پاس میری قسمت بدلنے کا کیا پروگرام ہے۔ کہیں وہ مجھ سے ہیروئن وغیرہ کی سمگلنگ تو نہیں کروانا چاہتا۔ یہ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں صاف انکار کر دوں گا اور اس کے بعد سلطان سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ ہیروئن کی سمگلنگ مجھے کسی حالت میں گوارا نہیں تھی۔

واشنگٹن کے ریلوے سٹیشن کے باہر پارکنگ لاٹ میں گاڑیاں ہی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میری آنکھیں سلطان کے ڈرائیور موہن لال کو تلاش کر رہی تھیں۔ اتنے میں میرے پیچھے سے کسی نے پنجابی میں کہا۔

"صاحب جی! آپ کا نام سلمان ہے نا؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک دبلا پتلا بوڑھا آدمی خاکی وردی پہنے کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تم سلطان صاحب کے شوفر موہن لعل ہو؟

"جی ہاں! آیئے۔"

اور وہ مجھے پارکنگ لاٹ میں لے گیا جہاں سلطان کی قیمتی عالی شان گاڑی کھڑی تھی۔ میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی واشنگٹن کی کشادہ بارونق سڑکوں پر نکل آئی۔ یہ سڑکیں میری جانی پہچانی تھیں۔ ہم ڈی سی کے علاقے سے نکل آئے تو ڈرائیور نے گاڑی برج روڈ کی طرف جانے والی روٹ پر ڈال دی۔ برج روڈ واشنگٹن کے مغرب میں دریائے پوٹامک کے پار ایک خوبصورت چھوٹے چھوٹے کاٹیجوں اور خوشنما پارکوں والا خاموش قصبہ ہے۔ قصبے سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ہمارے پنجاب کی طرح کا کوئی قصبہ تھا۔ برج ورڈ' واشنگٹن شہر کا حصہ ہی تھا۔ اسکی کاؤنٹی الگ تھی۔ اتنا فرق ضرور تھا کہ یہاں کوئی ہائی رائیز یعنی بلند و بالا عمارت نہیں تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے کاٹیج نما اک منزلہ دو منزلہ خوشنما مکان تھے جن کے آگے پیچھے چھوٹے چھوٹے پھولوں بھرے لان تھے۔ تقریباً ہر کاٹیج کی شکل ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔

برج ورڈ میں دو چار چھوٹے گروسری سٹور تھے اور تین ریستوران بھی تھے۔ ان میں سے ایک ریستوران سلطان کا تھا۔ اسکا نام میں نہیں لکھوں گا۔ یوں فرض کر لیں

کہ اسکا نام روبی ریستوران تھا۔ گاڑی روبی ریستوران کے سامنے ایک جانب پارکنگ لاٹ میں آکھڑی ہوئی۔ تو میں نے سلطان کو دیکھا۔ وہ ریستوران کے باہر لان میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ خوش بہار کا موسم تھا۔ اس کے بعد بارشوں اور تیز ہواؤں کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ سلطان اٹھ کر مجھے ملا۔ اس نے مجھے ساتھ والی کرسی پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ میرے لئے سینڈوچز اور کافی منگوائی۔ پھر لاہور پنڈی اور کراچی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ سلطان نے گہرا سانس بھر کر کہا:

"ایمان کی بات ہے سلمان بھائی! اپنا وطن' اپنا وطن ہی ہوتا ہے۔ ایک مدت سے امریکہ میں رہ رہا ہوں مگر وطن کی یاد روز آتی ہے۔ یہاں دماغ تو لگ گیا ہے۔ دل نہیں لگتا۔ مگر مجبور ہوں۔ سوچتا ہوں وطن واپس جاکر کیا کروں گا۔ وہاں کے حالات یہاں اخباروں میں پڑھتا ہوں تو دل کڑھتا ہے۔ پھر بھی مجھے اپنے پاکستان پر فخر ہے۔"

کچھ دیر تک ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں نے اس سے پوچھا کہ میرے بارے میں اس کے ذہن میں ایسا کونسا پروگرام ہے جس سے میری قسمت بدل سکتی ہے۔

سلطان مسکرایا:۔

"پتہ نہیں کیوں تمہارے چہرے پر کچھ ایسی بات لکھی ہوئی ہے کہ تمہیں دیکھتے ہی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کروں کہ تم ساری زندگی مجھے دعائیں دیتے رہو۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ تم پاکستانی ہو اور ماشاء اللہ مسلمان بھی ہو تو پھر تو میں نے تمہیں اپنے پروگرام میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"آخر وہ پروگرام ہے کیا؟ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔" میں نے بے چینی سے کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔

سلطان نے ٹرکش سگریٹ میری طرف بڑھایا۔ ایک سگریٹ میں نے اور ایک سگریٹ اس نے سلگالیا۔ فضامیں دن کی روشنی اور لان کے سبزے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ کہنے لگا:

"یہ بات اتنی جلدی ظاہر کرنے والی نہیں ہے۔ لیکن یقین کرو میں نے جو وعدہ کیا ہے' اسے پورا کروں گا۔"

میں نے اسے کریدتے ہوئے ازراہ مذاق پوچھا:

"کیا کوئی مافیا کا کوئی چکر ہے؟"

سلطان نے نفی میں سرہلایا:

"یہ تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہئے تھا۔ میں نے اس قسم کا ناجائز دھندا ساری زندگی نہیں کیا۔ میں منشیات کی سمگلنگ کو انسان کے خلاف کیا گیا سب سے بڑا جرم سمجھتا ہوں۔"

میں شرمندہ ہوگیا۔ میں نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا:

"سلطان بھائی! میں نے ہنسی مذاق کے موڈ میں ایسی بات کردی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایسے انسان نہیں ہو۔ آخر میں بھی انسان کی شکل دیکھ کر اس کی نفسیات کا اندازہ لگالیتا ہوں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ آئی ایم سوری!"

"فارگیٹ اٹ۔ کافی اور منگواؤں؟"

"بالکل نہیں' مجھے اب ضرورت نہیں اسکی۔"

ایک عجیب سی خاموشی چھاگئی۔ لگتا تھا کہ سلطان کو یا تو منشیات والی میری بات بُری لگی ہے اور اس نے مجھے اپنے پروگرام میں شامل کرنے کا ارادہ ترک کردیا ہے یا پھر وہ ابھی اس موضوع پر مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے بھی اس کے بعد اس موضوع کو نہ چھیڑا اور برج ورڈ کاؤنٹی میں صفائی ستھرائی اور اس کے ریستوران کے

بارے میں باتیں شروع کردیں۔ سلطان جیسے میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اسکا چہرہ بتارہا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ کہنے لگا:

"اس پر کل بات کریں گے۔ تم اگر چاہو تو میرے ہاں ٹھہر سکتے ہو۔ میرے ریستوران کے اوپر کمرہ خالی رہتا ہے۔ یہ میں نے مہمانوں کے لئے رکھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا:۔"شکریہ سلطان بھائی! یہاں میرا ایک بچپن کا دوست سلیم رہتا ہے۔ میں اس کے پاس ٹھہرجاؤں گا۔ اس سے ملاقات ہوئے بھی دیر ہوگئی ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

سلطان نے اتنا کہا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا:

"اچھا تو پھر کل اسی وقت ملاقات ہوگی۔ تمہارے دوست کا فلیٹ کہاں پر ہے؟ مجھے ایڈریس بتادو۔ میرا ڈرائیور تمہیں کل دس گیارہ بجے دن کے وقت تمہیں وہاں سے لے لے گا۔"

میں نے اسے اپنے دوست سلیم کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا نمبر اور علاقہ بتایا۔ اس نے چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر نوٹ کرلیا۔

"کیا اسکا کوئی ٹیلی فون نمبر تمہیں یاد ہے؟"

"نہیں۔ میں امریکہ آنے کے بعد پہلی بار اسے ملنے جاؤں گا۔"

"نو پرابلم! کل دس اور گیارہ بجے دن کے وقت میرا ڈرائیور گاڑی لے کر تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔"

"مگر اسے سلیم کے فلیٹ کا نمبر کہاں سے معلوم ہوگا؟"

"نمبر لابی میں سب لکھے ہوتے ہیں۔ ڈرائیور وہاں سے تمہیں فون کردے گا۔"

"او۔کے' بائی۔سی یو لیٹر!"

اس میں کوئی شک شبہ نہیں رہا تھا کہ سلطان کو منشیات کی سمگلنگ والی میری بات بری لگی تھی۔ مگر بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔ اب وہ واپس نہیں آسکتی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی کو بات کرنے سے پہلے دو تین بار نہیں تو کم از کم ایک بار ضرور سوچ لینا چاہئے کہ وہ کس شخص سے کونسی بات کرنے والا ہے۔ کیونکہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اپنا اثر دکھانے کے بعد واپس نہیں آیا کرتے۔ بہرحال جو ہونا تھا' ہو چکا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ سلطان ایک کشادہ دل انسان ہے۔ اس کی باتوں' چہرے اور رویے سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ اور وہ مجھے ضرور اپنے دولت کمانے کے راز میں شامل کرے گا۔ اب مجھے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھے جو کام بتانے والا ہے' وہ جائز کام ہے۔ ناجائز طریقوں سے دولت کا کوئی چکر نہیں ہے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ سلطان کی گاڑی مجھے میرے بچپن کے دوست سلیم کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے آگے چھوڑ گئی۔ یہ بلڈنگ میرے لئے نئی تھی۔ اس لئے کہ پہلے جب میں بھی واشنگٹن میں تھا تو وہ کسی دوسرے علاقے میں رہتا تھا۔ اس بلڈنگ کا ایڈریس اس نے مجھے خط میں لکھ دیا تھا۔ میں نے سلطان کے ڈرائیور سے کہا کہ وہ کل دس اور گیارہ بجے کے درمیان اسی جگہ آکر مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ ڈرائیور تجربہ کار تھا۔ کہنے لگا:

"صاحب جی آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں معلوم کرلوں گا۔ آپ کے دوست کا نام سلیم ہی ہے ناں؟"

میں نے اسے کہا:۔"تم ایک منٹ یہاں رکو۔ میں اندر سے ابھی سلیم صاحب کے فلیٹ کا نمبر معلوم کر کے بتا دیتا ہوں۔ تم مجھے لابی سے اس نمبر کے فلیٹ پر فون کر لینا۔"

ڈرائیور کو بلڈنگ کے احاطے میں چھوڑ کر میں بلڈنگ کی لابی میں آیا۔ وہاں دیوار پر ایک طرف بلڈنگ میں رہنے والوں کے ناموں کی فہرست لگی تھی۔ میں نے سلیم کا نام پڑھ کر آگے دیکھا۔ آگے فلیٹ کا نمبر E-22 لکھا تھا۔ میں نے یہ نمبر ڈرائیور کو جاکر

بتادیا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے لابی میں سے اس نمبر کے فلیٹ کا فون نمبر معلوم کر کے اوپر فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ تین چار سیکنڈ بعد سلیم نے فون اٹھایا۔

"سلیم سپیکنگ!"

میں نے اسکی آواز پہچان لی تھی۔ میں نے کہا:

"یار میں ہوں۔"

اسے میں نے اپنا اصلی نام ہی بتایا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آنے لگا تھا کہ مجھے سلطان کو اپنا اصلی نام بتادینا چاہئے تھا۔ اسے جب معلوم ہو گا کہ میرا یہ نام اصلی نہیں ہے تو وہ اسکا بھی برا منائے گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ میں کوئی بہانہ بنادوں گا پھر اگر مناسب معلوم ہوا تو اپنا یہی نام سلمان ہی رہنے دوں گا۔ دوسری طرف سے سلیم کی آواز آئی:

"تم اتنے دنوں سے نیویارک میں کیا کر رہے تھے' مجھ سے ملنے ہی نہیں آئے۔ فون تک نہیں کیا۔"

میں نے کہا:۔"تمہارا فون نمبر مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں اوپر آکر بات کرتا ہوں۔ میں آرہا ہوں۔"

"جلدی آؤ یار۔"

اور ایک قہقہے کے ساتھ سلیم نے فون بند کر دیا۔ میں اور سلیم امرتسر میں اکٹھے چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ ہماری اس زمانے سے دوستی چلی آرہی تھی۔ سلیم کو بھی امریکہ میں کئی برس ہو گئے تھے۔ شادی اس نے بھی نہیں کی تھی۔ ہر ماہ پیچھے اپنے بوڑھے ماں باپ کو رقم بھیج دیتا تھا۔ یہ ساری باتیں وہ مجھے خطوں میں لکھتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں وہ ایک کارخانے میں نئی گاڑیاں

دھونے پر ملازم تھا۔ اب پتہ نہیں کونسی جاب کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بازو کھول دیئے۔

"تم سیدھے میرے پاس کیوں نہیں آئے' نیویارک میں ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے سلیم کو بھی سلطان کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اسے یہی کہا کہ میں نیویارک میں اسے ہی ملنے آیا ہوں۔ کھانا ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ پھر ہم واشنگٹن کی سیرو سیاحت کو نکل گئے۔ وہ تمام جگہیں دیکھیں جہاں جہاں میں کام کرتا رہا تھا۔ ورجینیا کے علاقے میں کچھ پاکستانی ہمارے جاننے والے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں سلیم سے پوچھا تو کہنے لگا:

"وہ کہاں جائیں گے۔ وہیں رہ رہے ہیں جہاں پہلے رہتے تھے۔ وہی حال ہے جو پہلے روز تھا۔ دو' دو نوکریاں کرتے ہیں۔ برگر کھاتے ہیں اور صوفو پر سوتے ہیں۔"

ان میں ہاشم نام کے ایک شخص کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کسی زمانے میں لاہور ریڈیو سٹیشن پر ڈراموں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ میں نے سلیم سے کہا:

"چلو۔ ان لوگوں سے ملتے ہیں۔"

سلیم نے اپنی ایک گاڑی بھی خریدی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی کو ورجینیا جانے والے روٹ پر ڈال دیا۔

یہ ایک دو کمروں والا چھوٹا سا فلیٹ تھا جو ایک منزلہ گارڈن ہاؤس کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے پرانے فلیٹوں میں سے ایک تھا۔ اسکا کرایہ ساڑھے چار سو ڈالر ماہوار تھا' اور وہاں پانچ پاکستانی مل کر رہتے تھے۔ صرف ایک بیڈ تھا جس پر یہ لوگ رات کو یا دن کو اپنی اپنی ڈیوٹی کے حساب سے باری باری سوتے تھے۔ باقی روز فرش یا صوفوں پر سوتے تھے۔ کچن میں کاک روچ عام پھرتے نظر آتے تھے۔ گرمیوں میں ائر

کنڈیشنگ اور سردیوں میں ہیٹنگ اپنی طرف سے کرنا پڑتا تھی۔ بجلی اور گیس کا بل بھی کرائے میں شامل نہیں تھا۔ جیسا کہ ہائی رائز بلڈنگوں کے فلیٹ میں شامل ہوتا ہے۔

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ دو آدمی موجود تھے۔ باقی تین جاب پر گئے ہوئے تھے۔ موجود لوگوں میں ہاشم بھی تھا جسکی رات کی ڈیوٹی تھی اور دن کے وقت وہ ایک سٹور میں چار گھنٹے کام کرتا تھا۔ وہ ابھی ابھی چار گھنٹے کی ڈیوٹی دے کر آیا تھا۔ مجھے گلے لگ کر ملا۔ لاہور ریڈیو سٹیشن کے بارے میں باتیں شروع ہوگئیں۔ سلیم اپنے دوسرے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ میں اور ہاشم سگریٹ پیتے ہوئے فلیٹ کے باہر سیڑھیوں میں آکر بیٹھ گئے۔

میں نے اس سے پوچھا:

"ابھی اور کتنے دن امریکہ میں رہنے کا ارادہ ہے۔ دو برس تو تمہیں گذر گئے ہیں۔"

ہاشم کی آنکھیں رات کی ڈیوٹی کرتے کرتے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ کہنے لگا:

"جتنے روز دانہ پانی ہے' رہوں گا۔"

میں نے پوچھا: "کچھ پیچھے گھر بھی بھیجتے ہو؟"

کہنے لگا:۔ "ہاں دو نوکریاں کرتا ہوں۔ بڑی مشکل سے سو ڈیڑھ سو ڈالر ہی بھیج سکتا ہوں۔ بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ سوچتا ہوں ایک اور نوکری کرلوں تاکہ بہن کے ہاتھ پیلے کر سکوں۔"

میں نے کہا:۔ تم لوہے کے نہیں بنے ہوئے' گوشت پوست کے انسان ہو۔ تین نوکریاں کر کے کب تک جی سکو گے؟"

کہنے لگے :۔ "کیا کروں۔ مجبوری ہے۔ تین بہنیں ہیں۔ والد صاحب بیمار رہتے ہیں۔ ایک بہن کی شادی ہونے والی ہے۔ باقی دو بہنوں کی ڈولی بھی عزت آبرو سے رخصت کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ شخص امریکہ میں آکر پھنس گیا تھا۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ میں آدمی پیسے بچا کر گھر نہیں بھیج سکتا۔ پیسے کمانے کے لئے آدمی کو دبئی یا بحرین وغیرہ جانا چاہئے۔ پیسے وہاں بچتے ہیں۔ مگر ہاشم وغیرہ یہاں آکر جکڑ دیئے گئے تھے۔ وہ آیا امریکہ کے گلیمر سے متاثر ہو کر تھا مگر پھر امریکی گلیمر کے جال سے نہ نکل سکا۔ اس طرح میں ایک اور نوجوان کو بھی جانتا تھا جو امریکہ کے گلیمر سے متاثر ہو کر کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ گیا تھا۔ منہ اندھیرے نوکری پر جاتا تھا اور شام کے اندھیرے میں واپس آتا تھا۔ وہ بھی اکیلے فلیٹ میں نہیں رہ رہا تھا۔ چار چھ آدمی مل کر ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہ دو مہینے بعد کہیں گھر والوں کو سو ڈیڑھ سو ڈالر بھیج سکتا تھا۔ میں نے ہاشم سے کہا:

"جتنے پیسے تم یہاں اتنی مشقت کر کے گھر بھیجتے ہو' میرا خیال ہے اتنے پیسے تو تم لاہور میں رہ کر بھی کما سکتے تھے۔ پھر اپنا گھر ہوتا' اپنے بہن بھائیوں میں رہتے۔ اپنے وطن میں تو رہتے۔"

وہ لمبا سانس بھر کر بولا:

"سوچ کر تو یہی آیا تھا کہ یہاں بہت ڈالر کماؤں گا۔ کیا معلوم تھا کہ ڈالر کمانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ تم سناؤ۔ ابھی کتنے دن ٹھہرو گے۔ تم نے اچھا کیا کہ دو تین سال سرکاری نوکری کی۔ امریکہ کی جی بھر کر سیر کی اور واپس چلے گئے۔ مگر تمہاری نوکری سرکاری تھی۔ تم پیچھے ڈالر بھیج سکتے تھے۔ ہم تو جاب کرنے والے لوگ ہیں۔"

میں نے پوچھا:

"آج کل کونسی گرل فرینڈ ہے؟ وہ لمبے قد کی سوکھی امریکی عورت تمہارے پاس ہی ہے؟"

ہاشم مسکراتے ہوئے بولا:

"وہ تو کب کی جا چکی ہے۔ آج کل ایک اعلیٰ امریکی افسر کی نیگرو لڑکی میری دوست ہے۔ مگر میں اس سے بہت کم ملتا ہوں۔ کم بخت پر ڈالر بہت خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ حالانکہ ہم کسی اعلیٰ ریستوران میں لنچ نہیں کرتے۔ مگر یہ نیگرو لڑکی بے تحاشا بیئر اور شراب پیتی ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس کو زیادہ نہیں چڑھتی۔"

میں نے کہا:۔ "بس یہ باتیں تم لوگوں کو امریکہ سے نہیں ہلنے دیتیں۔ نیگرو اور گوری عورتیں' شراب اور عیش و عشرت۔۔۔۔"

ہاشم بولا:۔ "ہاں۔ تم ایسا کہہ سکتے ہو۔ ایسا ہے بھی' یہ چیزیں ہمیں یہیں مل سکتی ہیں۔۔۔!"

اتنے میں اندر سے سلیم نکل کر باہر آ گیا۔

"یار تم لوگ کب تک گپیں ہانکتے رہو گے۔ واپس چلنے کا ارادہ ہے کہ نہیں؟"

میں نے ہاشم سے کہا:

"اچھا دوست پھر ملیں گے۔ ابھی میں یہیں ہوں۔"

ہاتھ ملانے کے بعد میں سلیم کے ساتھ واپس روانہ ہوا۔ رات کو کھانے کے بعد سلیم کہنے لگا:

"چلو' فورٹینتھ سٹریٹ میں ڈانس دیکھنے چلتے ہیں۔"

یہ وہ سٹریٹ تھی جہاں کتنے ہی ڈانس کلب تھے۔ یہ سارے کمرشل کلب تھے اور یہاں طوائفیں بھی چل پھر کر اپنا دھندا کرتی تھیں۔ میں ان چیزوں سے نکل کر اونچی

فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا تھا۔ جس طرح سلطان پرواز کر رہا تھا۔ میں نے کہا: "نہیں یار۔ وہاں کا ماحول بڑا گندا ہے۔"

سلیم مجھ پر طنز کرتے ہوئے بولا:

"واہ! اتنی جلدی تمہارا اسٹینڈرڈ بدل گیا۔ تم مائیکل جیکسن نہیں ہو بھائی۔ ہم تم ایک ہی سطح کے آدمی ہیں۔ ہمارے لئے یہ فورٹینتھ سٹریٹ کی طوائفیں ہی مارلین منرو ہیں۔"

میں نے اپنے دل میں کہا:

"تمہارے لئے ہوں گی۔ میرے لئے نہیں ہیں۔ میں مارلین منرو کی سطح پر پہنچ کر امریکہ میں رہنا چاہتا ہوں۔ میں دوسرا کولمبس ہوں۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔ میں امریکہ کو فتح کروں گا۔"

لیکن سلیم نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ ویسے بھی اس کے آگے میرا انکار کرنا مشکل تھا۔ ہم گاڑی میں فورٹینتھ سٹریٹ آ گئے۔ یہ گلی نمبر چودہ واشنگٹن کی مال روڈ کے پاس ہی ہے۔ یہاں کا سارا ماحول جرائم پیشہ لگتا تھا۔ گاڑی کھڑی کی تو ایک نیگرو آ گیا۔

"مسٹر! ادھر گاڑی نہیں کھڑی ہوتی۔"

اسے سلیم نے چار ڈالر دیئے تو وہ بولا:

"نو پرابلم! تم جاؤ۔ میں اسکی حفاظت کروں گا۔"

سلیم نے مجھے پنجابی میں کہا:

"کوئی پتہ نہیں ہم واپس آئیں تو گاڑی کے چاروں ٹائر غائب ہوں۔ مگر مجبوری ہے۔۔۔"

ہم گاڑی لاک کر کے گلی نمبر چودہ میں آ گئے۔ ڈانس کلبوں کی پیشانیوں پر نیون سائن بورڈ جھلملا رہے تھے۔ کہیں سانپ بنا ہوا تھا۔ کہیں عریاں عورت ڈانس کرتی دکھائی گئی تھی جو جلتی بجھتی تھی۔ میں پہلے بھی اس گلی میں دو تین بار آ چکا تھا۔ مگر اب نہیں آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب میں اپنے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اعلیٰ ترین ماحول میں بلند ترین سطح پر جا کر عیش و عشرت کروں۔ اور اس کی ہلکی سی امید کی جھلک مجھے سلطان کی باتوں میں نظر آ گئی تھی۔

میں سلیم کے ساتھ اس گلی میں یوں چل رہا تھا جیسے ایک کروڑ پتی غریبوں کی بستی میں آ گیا ہو۔ دونوں جانب بلکہ جگہ جگہ فٹ پاتھ پر نیم عریاں امریکی طوائفیں کھڑی سگریٹ پی رہی تھیں اور اشاروں سے بلا رہی تھیں۔ پولیس والے بھی وہاں چل پھر رہے تھے۔ پولیس والے کو قریب آتے دیکھ کر یہ عورتیں آگے چل پڑتیں۔ پولیس والے بھی چشم پوشی پر مجبور تھے۔ کیونکہ یہ عورتیں باقاعدہ ٹیکس دیتی تھیں۔ ہم ایک کلب میں گھس گئے۔

وہاں کا ماحول بے حد آلودہ تھا۔ مس گلوریا کے زیر زمین ڈانس روم میں الکوحل کی بو کے ساتھ اعلیٰ قسم کی پرفیومز کی خوشبوئیں بھی تھیں مگر یہاں گھٹیا امریکی تمباکو، گھٹیا امریکی شراب اور بیئر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے لئے اب یہ بہت گھٹیا قسم کا ماحول تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اعلیٰ ترین ماحول کے لئے تیار کر لیا ہوا تھا۔ مگر اپنے دوست کے ساتھ وہاں مجبور ہو کر بیٹھنا پڑا۔

یہاں بیٹھنے کا طریقہ یہ تھا کہ بیئر منگوا کر پیتے رہو اور اس کے ساتھ ساتھ پیسے ادا کرتے جاؤ۔ اس کے سوا کوئی ٹکٹ وغیرہ نہیں تھا۔ یہاں میں پہلے بھی آتا رہا تھا۔ اس وقت تک مجھے امید بھی نہیں تھی کہ میں امریکہ میں رہ کر دولت مند بن سکوں گا۔ اب سلطان نے میرے دل میں امید کی شمع روشن کر دی تھی بلکہ اس نے مجھے یقین دلایا

تھا کہ اس کے منصوبے پر چل کر میں لکھ پتی بن سکتا تھا۔ چنانچہ میں بیزار نظروں سے گول چبوترے پر رقص کرتی عریاں، نیم عریاں عورتوں کو تک رہا تھا۔ یہ عورتیں بالکل مشین کے کل پرزوں کی طرح حرکتیں کر رہی تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں رومال تھا۔ کسی کے ہاتھ میں چینی پنکھا تھا۔ وہ ان چیزوں سے اپنے جسم کی عریانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ لوگ ان پر ایک ایک ڈالر کے نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔ سلیم بڑی دلچسپی سے یہ رقص دیکھ رہا تھا۔ کبھی میں بھی بڑی دلچسپی سے یہ رقص دیکھا کرتا تھا۔ مگر اب نہیں۔ اب میں کچھ اور دیکھنا چاہتا تھا۔

اب میری آنکھوں نے کچھ اور جلوے دیکھ لئے تھے۔

رات کے دس بجے ہم گلی نمبر چودہ سے واپس آئے۔ دوسرے دن سلیم ڈیوٹی پر یہ کہہ کر چلا گیا کہ اگر باہر جانا پڑے تو چابی نیچے رینٹل آفس میں دیتا جاؤں۔ مگر مجھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان وہاں سے جانا تھا۔ دس بجنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے۔ میں فلیٹ کو تالا لگا کر نیچے آگیا۔ چابی رینٹل آفس والوں کو دی اور لابی میں بیٹھ کر اس کے شیشے کے دروازے میں سے باہر دیکھنے لگا۔ کوئی سوا دس بجے سلطان کی گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے اس کا شوفر باہر نکل کر لابی کی طرف بڑھا تو میں اٹھ کر لابی سے باہر آگیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی سلطان کے ریستوران کی طرف روانہ ہوگئی۔

سلطان میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ کاؤنٹر پر اس کا ملازم بیٹھا تھا۔ وہ ریستوران کے لان میں آرام کرسی پر دراز تھا۔ مجھے گاڑی سے نکلتا دیکھ کر میری طرف بڑھا اور مجھے اوپر اپنے گیسٹ روم میں لے آیا۔ اس نے کافی اوپر ہی منگوالی۔ جب ملازم کافی رکھ کر چلا گیا تو سلطان نے اٹھ کر دروازہ لاک کر لیا اور میرے سامنے سلیپنگ صوفے پر بیٹھ

گیا۔ کافی کی ایک پیالی بنا کر اس نے مجھے دی۔ ایک پیالی اپنے لئے بنائی۔ ٹرکش سگرٹوں والا سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ مجھے دیا۔ ایک خود سلگایا اور بڑے اطمینان سے کش لے کر کہنے لگا:

"تمہارے دل میں یہ خیال ضرور آرہا ہوگا کہ آخر میں نے تم پر اعتبار کیوں کیا کہ اپنا ایک خاص راز تمہیں بتانے جارہا ہوں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ تم میرے ہم وطن اور ہم شہر یعنی پاکستانی اور لاہور کے رہنے والے ہو۔ دوسری وجہ جذباتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم پہلی ملاقات میں ہی مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے امریکہ میں ابھی تک یہ راز کسی کو نہیں بتایا۔ اب جبکہ میں تمہیں یہ راز بتانے والا ہوں تو سب سے پہلے میں تم سے ایک قسم لوں گا کہ تم یہ راز میری اجازت کے بغیر آگے کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ میں تمہیں خدا کی قسم لینے پر مجبور نہیں کروں گا۔ بس تمہیں ایک دیانتدار مرد بن کر مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ تم یہ راز میری اجازت کے بغیر کسی پر ظاہر نہیں کرو گے۔ کیا تم وعدہ کرتے ہو؟"

میں نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا:

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

سلطان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"او۔ کے، یہ اچھی بات ہے۔ میں تم پر اعتبار کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے وعدے پر قائم رہو گے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا۔ سگریٹ پیتا رہا۔ میں بھی اس کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے رازدارانہ انداز میں کہا: "تم ضرور سوچ رہے ہوگے کہ میرا یہاں واشنگٹن کے مضافات میں چھوٹا سا ریستوران ہے۔ پھر میرے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی کہ میں نے قیمتی کار اور وہ بھی شوفر ڈریون کار رکھی ہوئی ہے۔

شہر کے پوش علاقے میں میرا اپنا بنگلہ ہے اور واشنگٹن اور نیویارک کی اونچی سوسائٹی کے لوگوں سے میرے سوشل تعلقات ہیں۔ یہاں چھوٹے سے ریستوران کے مالک کی اتنی معیشت نہیں ہوتی۔ اسے بمشکل اتنی آمدنی ہوتی ہے کہ یہاں کے بے شمار ٹیکس ادا کرنے کے بعد تھوڑے سے ڈالر کما لیتا ہے۔ تمہیں ضرور خیال آیا ہو گا۔"

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا:

"مجھے یہ خیال بالکل نہیں آیا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ کوئی دوسرا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ یا آپ نے کوئی شیئرز وغیرہ خرید رکھے ہیں۔"

سلطان بولا:۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب میں تمہیں اپنی دولت کا راز بتانے لگا ہوں۔ یہ دولت تم بھی حاصل کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اتنے دولت مند بن جاؤ کہ پاکستان میں جائداد بنا سکو اور جب تم واپس وطن جاؤ تو رشتے دار تمہاری امارت پر رشک کریں۔ اب میری بات سنو!"

وہ کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد سگریٹ کا کش لے کر کہنے لگا:

"جنوبی امریکہ کے ملک برازیل کے شمال مشرق میں دریائے ایمزون جہاں بحر اوقیانوس میں گرتا ہے، وہاں دریا کے ڈیلٹے میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام ماکاپو ہے۔ ماکاپو کے آگے برازیل کے گھنے خطرناک جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان جنگلوں میں ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کو سیرانوادو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے اس پہاڑی علاقے پر ایک ریڈ انڈین سردار کی حکومت تھی۔ تاریخ میں بھی لکھا ہے اور میرے تجربے نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ جب اس قبیلے کا کوئی آدمی مرجاتا تھا تو اس کی لاش کو سیرانوادو کی پہاڑیوں کے اندر بنی ہوئی قدرتی سرنگ میں اس لاش کے وزن کے برابر سونے کی اشیاء قبر میں دفن کر دی جاتی تھیں۔ یہ ان کی ایک رسم تھی۔ یوں اس سرنگ میں دو سو برس تک سونا خفیہ طور پر بنائی گئی قبروں

میں دفن ہوتا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ جمہوریت کا زمانہ آگیا۔ برازیل میں جو حکومت قائم ہوئی، اس کی فوجوں نے ان پہاڑیوں پر قبضہ کرنے کے لئے حملہ کر دیا۔ ریڈ انڈین سردار نے قبیلے کے لوگوں کا سارا سونا اور اپنے محل میں جمع کیا ہوا سارا سونا اور قیمتی ہیرے جواہرات سرنگ کے اندر قبروں کے قریب ہی دفن کر کے سرنگ کا منہ بھاری پتھروں سے اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھ کر کسی کو پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا کہ یہاں کوئی سرنگ بھی ہے۔ اس کے بعد سردار نے اپنے قبیلے کے آدمیوں کو ساتھ لیا اور ایمزون کے جنگلوں میں روپوش ہو گیا۔ برازیلی فوجوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا لیکن کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ ان پہاڑیوں میں ایک خفیہ سرنگ ہے جس کے اندر اربوں ڈالر بلکہ کھربوں ڈالر کے سونے کا خزانہ مدفون ہے۔ وقت گذرتا گیا۔ کہتے ہیں کہ ریڈ انڈین سردار نے اس پہاڑی سرنگ کا ایک نقشہ بنا کر رکھ لیا تھا۔ جب وہ مرنے والا تھا تو یہ نقشہ اس نے اپنے بیٹے کے حوالے کر دیا۔ بیٹا ایک روز اپنے باپ دادا کے خزانے کی تلاش میں چند ساتھیوں کو لے کر نکل کھڑا ہوا۔ اب وہ ریڈ انڈین وحشی نہیں تھے بلکہ انہوں نے شرٹیں اور پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ وہ اس سارے جنگل اور پہاڑی علاقے سے واقف تھے۔ یہ لوگ سرنگ کے دہانے تک پہنچ گئے۔ پتھروں کو توڑ کر سرنگ کا منہ کھولا۔ مشعلیں روشن کر کے سرنگ میں آگئے۔ انہیں بہت جلد کچھ قبریں نظر آئیں۔ انہوں نے انہیں کھودا تو نیچے سے سونے کے برتن، سونے کی ڈلیاں، سونے کی سلاخیں اور ہیرے جواہرات نکلنا شروع ہو گئے۔ وہ سارا خزانہ بوریوں میں بند کر کے سرنگ سے باہر آئے تو باہر برازیلی فوج کی پوری پلٹن بندوقیں تانے کھڑی تھی۔ دونوں جانب سے گولیاں چلنے لگیں۔ مگر ریڈ انڈین کا اسلحہ ختم ہو گیا۔ برازیلی فوجیوں نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا اور سونے کی بوریوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر برازیل کی گورنمنٹ کی طرف سے سرنگ میں

سونے کی تلاش کا کام شروع ہوگیا۔ دو تین سالوں کے اندر اندر ساری قبروں کے خزانے مل گئے۔ حکومت وہ سارا سونا اور ہیرے جواہرات کا صندوق اٹھاکر لے گئی اور اسے قومی خزانے میں جمع کرا دیا گیا۔"

میں بڑی دلچسپی اور غور سے سلطان کی بات سن رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں الف لیلوی داستان سن رہا ہوں۔ سلطان نے ٹھنڈی کافی کا گھونٹ بھرا اور ذرا سا مسکرا کر کہنے لگا:

"تم بھی حیران ہو رہے ہوگے کہ میں اس ماڈرن زمانے میں، کمپیوٹر اور خلائی سیاروں کے دوز میں تمہیں مدفون خزانوں کی داستان سنانے بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن میرے دوست! جس طرح خلا میں مصنوعی سیاروں کا گردش کرنا اور کمپیوٹروں کا ایک ہزار فائلوں کے ڈیٹا کو اپنے اندر جمع کر لینا اور ہوائی جہازوں کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پرواز کرنا ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس زمین کے اوپر اور زمین کے اندر قدرت کے ایسے راز اور خزانے چھپے ہوئے ہیں، ایسی ایسی توانائیاں پوشیدہ ہیں کہ انسان کی سائنسی عقل ابھی تک ان تک نہیں پہنچ سکی۔ کبھی کبھی جب کہیں کوئی عقل کو حیران کر دینے والا معجزہ رونما ہوتا ہے تو سائنس دان کے پاس اس کو جھٹلانے کے سوا کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ مدفون خزانے بھی ایک روایت اور دیومالا کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔"

سلطان ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو میں نے پوچھا:

"کیا اب وہاں کچھ نہیں ہے؟"

سلطان مسکرانے لگا:۔۔۔

"میرے دوست! میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے یہ سوال پوچھو۔ اصل میں جو راز میں تم کو بتانے چلا ہوں، وہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ حکومت نے سب قبروں کو کھنگال کر

وہاں سے سارا خزانہ نکال لیا تھا۔ اس کے بعد سرنگ مہم جو لوگوں کے حوالے کر دی گئی۔ اور ان لوگوں نے سرنگ پر ہلہ بول دیا۔ ایک سال تک لوگ ادھڑی ہوئی قبروں کے گڑھوں میں سے بچے کھچے سونے کی پتریاں، چمچے وغیرہ نکالتے رہے۔ اس کے بعد جب وہاں سوائے مٹی اور پتھروں کے کچھ باقی نہ رہا تو لوگوں نے سرنگ کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ وقت گذرتا چلا گیا۔ لوگوں میں اس سرنگ کے بارے میں طرح طرح کے توہمات جنم لینے لگے۔ یہ بات مشہور ہوگئی کہ سرنگ پر بدروحوں کا قبضہ ہے۔ قبروں کی روحیں لوگوں سے بدلہ لینے کے لئے وہاں آگئی ہیں۔ جو کوئی سرنگ میں جاتا ہے۔ پھر واپس نہیں آتا۔ ایک آدمی نے سرنگ پر کتاب لکھ ڈالی اور اس میں بتایا کہ وہ سرنگ میں گیا تھا مگر وہاں اس نے انسانی ڈھانچے دیکھے جو منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکلتے تھے اور وہ بڑی مشکل سے جان بچاکر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن ایک اس سے بھی بڑا خزانہ ابھی سرنگ میں موجود تھا۔ یہ خزانہ ریڈ انڈین سردار کی قبر میں دفن تھا۔ ریڈ انڈین سردار کی قبر ابھی تک کسی کو نہیں ملی۔ حکومت کا خیال تھا کہ ان قبروں میں ہی سردار کی ایک قبر تھی اور حکومت نے سردار کی قبر کا خزانہ بھی نکال لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قبر کا سراغ کسی کو نہیں ملا۔"

میں نے پوچھا:۔"کیا اس قبر کا ابھی تک کسی کو سراغ نہیں ملا؟"

سلطان نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا:

"یہ راز مجھے میرے ایک ریڈ انڈین دوست نے بتایا کہ ریڈ انڈین سردار کی قبر موجود ہے مگر اس سرنگ میں نہیں بلکہ اسی پہاڑی سلسلے کی ایک دوسری پہاڑی میں ہے۔۔۔"

میں نے کہا:۔"میرا خیال ہے تمہارے ریڈ انڈین دوست کو بھی مغالطہ لگا ہوگا۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں تھی۔" سلطان نے کہا۔ "ریڈ انڈین سردار کی قبر موجود تھی۔ میں نے اس قبر کو اور اس قبر کے خزانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

میں سلطان کا منہ تکنے لگا۔ اب مجھے سمجھ آگئی تھی کہ اس کی دولت کا راز کیا ہے اور وہ یہی راز مجھے بتانے والا تھا۔ میرے دل میں دولت کے لالچ نے ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ میرے اندر اس خزانے تک پہنچنے کی شدید خواہش بیدار ہو چکی تھی۔

میں نے سلطان سے پوچھا:

"کیا برازیل کی حکومت کو ابھی تک اس خزانے کا علم نہیں ہوا؟"

"نہیں۔ سارے کا سارا خزانہ وہاں پہاڑی کے اندر موجود ہے مگر ایک بات میرے ریڈ انڈین دوست کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ یہ کہ ریڈ انڈین سردار کی قبر میں سارا خزانہ نہیں تھا۔ بلکہ خزانے کا تھوڑا سا حصہ موجود تھا۔ باقی کا خزانہ سرنگ میں پہاڑی کے اندر ہی اندر فاصلے فاصلے پر خفیہ جگہوں پر دفن کیا ہوا تھا۔ ایسا کس نے کیا' یہ بات میرے ریڈ انڈین دوست کے لئے ایک معمہ تھی۔ بہرحال ہم وہاں سے کچھ سونا اور جواہرات تلاش کر کے ساتھ لے آئے۔ میرے دوست نے ان چیزوں کے تین حصے اپنے پاس رکھ لئے اور ایک حصہ وعدے کے مطابق مجھے دے دیا۔ اب وہاں سے سونے کی کچھ سلاخیں اور چند ایک قیمتی ہیرے برازیل سے یہاں لانا ایک مشکل مسئلہ تھا۔ لیکن میرے ریڈ انڈین دوست نے میرا یہ مسئلہ بھی حل کرا دیا۔ اس نے میری تمام چیزیں برازیل کے دارالحکومت برازیلیا میں ہی خفیہ ایجنٹوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ میں فروخت کروا دیں اور مجھے اس کے عوض ڈالر مل گئے۔ یہ اتنے ڈالر تھے کہ میں اگر ساری زندگی امریکہ میں جان ماری کرتا رہوں تو ان ڈالروں کا آدھا حصہ بھی نہیں کما سکتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میں مہینے میں ایک بار برازیل کے ساحلی شہر ماکاپو جاتا ہوں۔ میرا ریڈ انڈین دوست جسکا نام سانگوش ہے'

وہاں ایک بہت بڑی فرم کا مالک ہے۔ یہ فرم ہیرے جواہرات اور قیمتی نوادرات کا کاروبار کرتی ہے۔ ہم دونوں چھٹیاں گذارنے اور سیر و تفریح کے بہانے ماکاپو کی پہاڑیوں میں نکل جاتے ہیں اور ریڈ انڈین سردار کے بکھرے ہوئے مدفون خزانے کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ ہر بار ہمیں کوئی نہ کوئی سونے کی ڈلی یا قیمتی ہیرے نیلم پکھراج وغیرہ ضرور مل جاتے ہیں۔ ان میں سے میں اپنا تیسرا حصہ وہیں برازیلیا میں اپنے دوست کے ذریعے فروخت کر کے امریکی ڈالروں کی شکل میں رقم اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا ہوں۔"

میں نے کہا:۔ "کیا تم اس بار مجھے بھی ساتھ نہیں لے جاسکتے۔؟ لیکن تمہارا ریڈ انڈین دوست اسے ہرگز پسند نہیں کرے گا۔"

سلطان بولا:۔ "میں نے یہ ساری داستان تمہیں اسی لئے سنائی ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو بھی وہاں لے جاؤں اور تم بھی اپنی قسمت آزماؤ۔"

"کیا تمہارا ریڈ انڈین دوست سانگوش اسکی اجازت دے دے گا؟"

سلطان کہنے لگا:

"اس دوران میں نے فون پر اس سے بات کر کے اس کی اجازت لے لی ہے۔ میں نے اسے کہا ہے کہ میرا چھوٹا بھائی پاکستان سے آیا ہوا ہے۔ اسکی مالی حالت بہت خراب ہے۔ نیویارک میں پٹرول پمپ پر جاب کرتا ہے مگر پیچھے اپنے بال بچوں کو کچھ نہیں بھیج سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی مدد کروں اور میری طرح وہ بھی خوش حال ہو جائے۔ سانگوش کے ساتھ چونکہ میری بڑی گہری دوستی ہو چکی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدار ہیں۔ اس لئے وہ مان گیا ہے۔ مگر اس نے یہ شرط لگائی ہے کہ پہلے وہ تم سے ملے گا۔ اس لئے تمہیں اس کے پاس جانا ہو گا۔ اگر تم اپنی گفتگو اور اپنے رویے سے اس کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ تم ایک قابل اعتماد نوجوان

ہو تو وہ تمہیں اپنے ساتھ خفیہ پہاڑی سرنگ میں لے جائے گا۔ تم اس کے ساتھ وہاں کھدائی کرو گے۔ وہاں اگر کچھ مل گیا جس کا مجھے یقین ہے کہ ضرور ملے گا تو اس میں سے ایک حصہ تمہارا بھی ہو گا۔"

سلطان نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا:

"یہ مہم جوئی کا کام ہے۔ کسی جگہ ڈاکہ مارنے والی بات نہیں ہے۔ یہ ایڈونچر ہے اور تمہارے حوصلے، صبر اور ہمت کا امتحان ہے۔ اگر تم ثابت قدم رہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری قسمت بدل جائے گی۔ تم پیچھے اپنے گھر اتنے ڈالر بھیج سکو گے کہ تمہارے رشتے داروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ تم لاہور، اسلام آباد میں میری طرح اپنی کوٹھیاں بنوا سکو گے۔ تمہارے بچے اعلیٰ سکولوں میں تعلیم حاصل کریں گے۔ اس سے زیادہ تمہیں اور کیا چاہئے۔"

مجھ پر چونکہ دولت حاصل کرنے کا بھوت پوری طرح سوار ہو چکا تھا اس لئے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس دنیا میں صرف اس آدمی کی عزت ہوتی ہے جس کے پاس دولت کی فراوانی ہو۔ میں بھی اپنے رشتے داروں کے آگے اپنے گھر والوں کے سر اونچے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے حامی بھر لی اور سلطان سے کہا:

"تم جس وقت کہو، میں برازیل جانے کو تیار ہوں اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے رویے سے تمہیں اور تمہارے دوست سانگوش کو کبھی ناامید نہیں کروں گا۔ یہ راز میرے دل میں ہمیشہ راز رہے گا۔"

"بس یہی اس مہم کی سب سے اہم چابی اور کنجی ہے۔" سلطان نے کہا۔ "ابھی تک یہ راز صرف ہم دونوں کے پاس محفوظ ہے۔ اب تم بھی اس میں شریک ہو گئے ہو۔ اس رازداری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ برازیل کی حکومت نے اس سارے علاقے کو سرکاری تحویل میں لے لیا ہوا ہے۔ اگرچہ وہاں اب کھدائی کا کام بالکل نہیں ہو رہا

اور سرکاری طور پر وہاں سونا تلاش کرنے کی مہم ترک کر دی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی وہاں کھدائی کرنا اب بھی قانوناً جرم ہے۔ اور پکڑے جانے پر اسکی سزا وہاں کے قانون کے مطابق کم از کم دو سال کی ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی تمہیں اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر کے رکھنا ہو گا۔"

میں نے کہا:۔ "یہ راز میرے سینے میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا سمجھو۔"

سلطان نے سگریٹ بجھاتے ہوئے خوش ہو کر کہا:

"بس میں یہی چاہتا تھا۔ اگر میرے کسی ہم وطن کی بھلائی ہو جائے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ اب ایسا ہے کہ میں کل کے جہاز میں تمہاری سیٹ بک کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں سانگوش کو فون پر اطلاع بھی کر دوں گا اور تمہیں اس کے نام ایک خط بھی دے دوں گا۔ لفافے پر اس کی فرم کا پورا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لکھا ہو گا۔ اس کو فون پر یہی بتانا کہ تمہارا نام سلمان ہے اور تم برازیلیا پہنچ گئے ہو۔ یہ فون تم ایئرپورٹ سے کرو گے۔ وہ تمہیں لینے کے لئے گاڑی بھیج دے گا۔"

جب میں نے سلطان سے کہا کہ میرے پاس کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ تو وہ ہاتھ کو جھٹک کر بولا:

"تمہیں دوست کہا ہے اور اپنا رازدار بنایا ہے تو اب تمہارے اور میرے پیسوں میں کوئی فرق نہیں۔ میرے پاس کافی پیسے ہیں۔ اگر یہ میرے ہم وطن اور ہم شہر دوست کے کام نہیں آئیں گے تو پھر کس کام آئیں گے۔ اب اگر تمہیں نیویارک جا کر اپنے دوست سے ملنا ہے تو اسے مل آؤ۔ مگر رات کو واپس واشنگٹن ضرور پہنچ جانا ہو گا۔"

میں نے فوراً کہا:

"مجھے اپنے دوست کے پاس جانے کی کوئی ایسی ضرورت نہیں۔ میں یہیں تمہارے پاس ہی رہوں گا۔"

سلمان خوش ہو کر بولا:

"اوکے۔ چلو اب نیچے ریستوران میں چلتے ہیں۔ میں برازیلیا ایئرلائن والوں کو فون کر کے کل کی کسی فلائیٹ میں تمہاری سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ہم نیچے آ گئے۔ میں کاؤنٹر کے پاس ایک طرف صوفے پر بیٹھ گیا۔ سلطان فون پر نمبر گھمانے لگا۔ میرا ذہن الف لیلیٰ کے خزانوں کی کہانیوں میں کھو گیا تھا۔ مہم جوئی اور ایڈونچر پہلے ہی میرے خون میں شامل تھا۔ یہ بھی ایک مہم اور ایڈونچر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس ایڈونچر میں کامیاب ہوں گا اور بہت جلد مین دولت میں کھیل رہا ہوں گا اور اگلے سال پنڈی کراچی اور لاہور میں میرے بنگلے تیار ہو رہے ہوں گے اور لاہور کے کسی بینک میں میرے لاکھوں روپے جمع ہو چکے ہوں گے۔ یہ ایڈونچر کے اعتبار سے بھی ایک منفی سوچ تھی۔ ایڈونچر کی روح کے منافی بات تھی مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مجھ پر دولت کمانے اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے کا خیال اور خواہش بھوت بن کر سوار ہو چکی تھی اور یہ بھوت مجھے اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔ سلطان کسی ایسے آدمی کو فون کر رہا تھا جس نے میرے پاسپورٹ پر برازیل کا ویزا لگوانا تھا۔ اس کی ہر جگہ واقفیت تھی۔ کہنے لگا:

"میں پاسپورٹ ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ سامان تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک بریف کیس ہی تھا۔ پاسپورٹ میں اس میں نہیں رکھتا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے پاسپورٹ نکال کر سلطان کے حوالے کر دیا۔ وہ پاسپورٹ کے ورق الٹ کر غور سے دیکھتا رہا۔ کہنے لگا:

"ٹھیک ہے۔ میں نے ایک آدمی کو فون کیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں آکر تمہارا پاسپورٹ لے جائے گا اور برازیل اور آس پاس کے کچھ اور ملکوں کے ویزے لگوا کر لے آئے گا۔ یہ لوگ میرا کام بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔ میں ان کو کچھ نہ کچھ دیتا رہتا ہوں۔۔۔"

ہم دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے کہ سلطان کا آدمی آگیا۔ یہ امریکی تھا۔ سلطان نے اسے میرا پاسپورٹ دیا اور انگریزی میں اسے سمجھانے لگا کہ ویزا جلدی لگنا چاہئے۔ وینزویلا' سری نام اور فرنچ گیانا کے بھی ویزے ساتھ ہی لگنے چاہیں۔ امریکی میرا پاسپورٹ لے کر چلا گیا۔ اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ ابھی دفتروں میں دو تین گھنٹے باقی تھے۔ میں حیران رہ گیا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے وہ آدمی میرے پاسپورٹ پر ویزے لگوا کر لے آیا۔ برازیل کے علاوہ جنوبی امریکہ کے ممالک وینزویلا' سری نام اور فرنچ گیانا کے بھی ویزے لگے ہوئے تھے۔ سلطان کہنے لگا:

"یہ ملک شمالی برازیل میں ہیں اور جہاں تم جا رہے ہو' وہاں ان کی سرحدیں قریب قریب ہی ہیں۔ کوئی بھی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ اب میں تمہاری سیٹ بک کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

اب اس نے برازیلین ائرلائنز میں فون کیا۔ وہاں بھی اس کے جاننے والے موجود تھے۔ مجھے اگلے روز کی فلائیٹ میں جگہ مل گئی۔ سلطان نے اسی وقت اپنے شوفر کو میرا پاسپورٹ اور ڈالر دے کر روانہ کر دیا۔ ہم چائے پینے لگے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد شوفر نے واشنگٹن سے برازیلیہ کا اون وے ٹکٹ سلطان کو دیا۔

سلطان نے ٹکٹ کو پڑھ کر کہا:

"تمہاری فلائیٹ صبح دس بجے ڈیلس ایئرپورٹ سے روانہ ہوگی۔"

پھر کہنے لگا:۔ "دیکھا اس طرح کام ہوتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ امریکہ کے نظام کی خوبی ہے۔ نہیں۔ یہ میرے ذاتی کام کر رہے تھے۔ یہاں بھی پیسہ چلتا ہے۔ پیسے کے بغیر یہاں کسی سے دوستی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔"

سلطان کو زندگی میں کچھ ایسے تلخ تجربے ہو چکے تھے کہ وہ دولت کو انسانی تعلقات کی بنیاد سمجھنے لگا تھا۔ اسی لئے اس نے خدا جانے کس طرح برازیل میں ایک ریڈ انڈین دوست بنایا۔ پھر مدفون خزانوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا رہا اور آخر وہاں سے کافی دولت سمیٹ لانے میں کامیاب ہو گیا۔ بلکہ ابھی تک وہاں کا پھیرا لگا کر کچھ نہ کچھ ہر پھیرے میں لے آتا تھا۔

رات میں نے اپنی دوست سلیم کے فلیٹ پر گذارنے کی بجائے سلطان کے گیسٹ روم میں گذاری اور ساری رات سوچتا رہا کہ کہیں دولت کا یہ لالچی چکر مجھے کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔ پھر یہ کہہ کر میں اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا کہ اس میں کوئی خاص غیر قانونی بات نہیں ہے۔ ایک ایڈونچر ہی ہے۔ اگر مدفون خزانے میں سے کچھ بھی حصہ مل گیا تو میری قسمت بدل جائے گی' کایا پلٹ جائے گی۔ میں سیاہ مرسڈیز یہاں سے خرید کر پاکستان ساتھ لے جاؤں گا۔ لاہور کے گلبرگ میں ایک عالی شان کوٹھی بناؤں گا۔ میرے بچے اعلیٰ انگریزی سکولوں میں تعلیم حاصل کریں گے' میں بچوں کو اپنی دس بارہ لاکھ کی گاڑی میں بٹھا کر رشتے داروں کے گھر جاؤں گا تاکہ انہیں میری شان دیکھ کر مجھ پر رشک آئے اور میری بیوی کی بھی عزت افزائی ہو۔

اس قسم کی غلط اور اونچی سوچ تھی جس نے آگے چل کر مجھے ایسی مصیبت میں پھنسا دیا کہ خدا نے میری زندگی لکھی ہوئی تھی تو بچ گیا' ورنہ آج یہ داستان بھی قلمبند کرنے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔ میرے دوست سلیم نے مجھ سے پوچھا بھی کہ واشنگٹن

میں ایسا کونسا دوست ہے جس کے پاس میں رات بسر کرنے کو جارہا ہوں۔ میں نے یونہی اسے آنکھ مار کر کہا:

"بس ایک چکر ہے۔"

اور وہ قہقہہ لگا کر بولا:

"بڑے حضرت ہو یار تم بھی۔"

کہتے ہیں اگر آدمی کے دل میں گناہ کا خیال بھی آئے تو فرشتے اس کے حساب میں وہ گناہ ڈال دیتے ہیں۔ اور جب آدمی جھوٹ موٹ بھی کسی سے کہے کہ میں فلاں گناہ کرنے جارہا ہوں تو سمجھ لیں کہ آدمی اس گناہ کا ارتکاب کر چکا ہے۔ پھر چاہے وہ گناہ کا ارتکاب نہ بھی کرے، تب بھی اس کے نامہ اعمال میں وہ گناہ لکھ دیا جاتا ہے اور جب آدمی اس گناہ میں کسی کو گواہ بھی بنالے تو اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے فرضی گناہ میں اپنے دوست سلیم کو اپنا گواہ بنالیا تھا۔ اب یہ گناہ کر چکا تھا۔ بلکہ دو گناہ کر چکا تھا۔ میری بربادی یہیں سے شروع ہوگئی تھی۔

میں نے رات سلطان کے ریستوران کے اوپر والے کمرے میں گذاری۔ صبح اٹھ کر تیاری شروع کر دی۔ سلطان آٹھ بجے ہی آگیا۔ کہنے لگا:

"ڈیلس ایئر پورٹ یہاں سے کافی دور ہے۔ گاڑی میں کم از کم پون گھنٹہ تو لگ جائے گا۔"

میرے پاس صرف ایک بریف کیس ہی تھا۔ میں نے اٹھا کر گاڑی میں رکھا اور سلطان ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن بے معلوم سی آواز میں غرایا اور گاڑی ڈیلس ایئر پورٹ کی طرف چل پڑی۔ ہم نو ساڑھے نو بجے کے قریب وہاں پہنچے۔ لاؤنج کے سامنے کینٹین میں بیٹھ گئے۔ سلطان نے کہا:

"میں نے اپنے دوست سانگوش کو رات فون پر ساری بات ایک بار پھر سمجھادی تھی اور یہ بھی بتادیا تھا کہ تم فلاں فلائیٹ سے یہاں سے روانہ ہو رہے ہو۔"

سلطان نے مجھے اپنی نوٹ بک میں سے سانگوش کی تصویر نکال کر دکھائی۔ اس آدمی کی عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ نین نقش بالکل ریڈ انڈین کے ہیں۔ آنکھیں جاپانیوں ایسی تھیں۔ مگر اس نے ماڈرن زمانے کے مطابق سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا اور لان میں کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔

"وہ خود ایئر پورٹ پر نہیں آئے گا۔ اسکا شوفر گاڑی لے کر آئے گا۔ ایئر پورٹ لاؤنج کے باہر شوفر نے ایک پلے کارڈ اٹھا رکھا ہوگا جس پر انگریزی کے بڑے بڑے حروف میں تمہارا نام سلمان لکھا ہوا ہوگا۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہوگے۔"

میں نے کہا:۔ "بالکل سمجھ گیا ہوں۔"

سلطان مجھے اپنی سوچ کے مطابق سمجھانے لگا:

"یوں سمجھ لو کہ یہ تمہاری زندگی کا ایک سنہری موقع ہے جو تمہیں مل رہا ہے۔ زندگی میں اس قسم کے مواقع بار بار نہیں ملا کرتے۔ اگر تم نے سوجھ بوجھ، عقل مندی، ہمت اور محنت سے کام کیا اور حوصلہ نہ ہارا تو تم ضرور کامیاب ہوجاؤ گے۔ ایک بات خاص طور پر ذہن میں رکھنا، میرا دوست سانگوش ریڈ انڈین ہے اور جس طرح دوسرے ریڈ انڈین متعصب ہوتے ہیں، وہ بھی اپنے دیومالائی مذہب کے بارے میں بڑا متعصب ہے۔ اگرچہ وہ ماڈرن ہوگیا ہوا ہے مگر ریڈ انڈین لاکھ ماڈرن ہوجائیں، وہ ریڈ انڈین ہی رہتے ہیں۔ کبھی ان کے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں برا لفظ زبان پر نہ لانا۔ اگر وہ اپنے قبیلے اور مذہب کی رسومات کے بارے میں کوئی ذکر کرے تو ہرگز یہ مت کہنا کہ یہ فرسودہ باتیں ہیں۔ سانگوش کے آباء و اجداد اپنے قبیلے کے سردار ہوا کرتے تھے۔ اور مدفون خزانوں پر اپنا جائز حق جتاتا ہے۔ اس کے اس

حق پر بھی کوئی اعتراض نہ کرنا۔ وہ پہلے پہل تم سے بالکل نہیں کھلے گا۔ تم اپنی طرف سے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ اسے موقع دینا کہ وہ تم سے بے تکلف ہے۔"

باتوں ہی باتوں میں فلائیٹ کا وقت ہو گیا۔ سلطان نے کہا:

"اب تم جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔ تم جس وقت چاہو مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ تمہارے پاس بھی میرے ٹیلی فون نمبر ہیں اور سانگوش کے پاس بھی ہیں۔ وہاں جاکر واپس آنے کی جلدی نہ کرنا۔ وہاں اگر ایک بار ناکامی ہوئی تو ہمت نہ ہارنا۔ دوسری بار پھر کوشش کرنا۔ سانگوش تمہارے ساتھ ہی ہو گا۔ تمہاری رہائش کا انتظام بھی اسی کے ہاں ہو گا۔ خدا حافظ!"

سلطان چلا گیا۔ میں نے گیٹ میں سے گذر کر کسٹمز کے کاؤنٹر کی طرف جانے سے پہلے بریف کیس ایکس رے کرایا۔ کاؤنٹر پر میرے بریف کیس کو کھول کر بھی دیکھا گیا۔ میرے پاس سوائے میری ذات کے اور کوئی قابل اعتراض شے نہیں تھی۔ میں اسی لئے قابل اعتراض تھا کہ میرے ذہن میں خطرناک اور منفی پروگرام مرتب ہو چکے تھے اور میں رزق حلال کی بجائے غلط طریقے سے دولت کمانے کے چکر میں برازیل جا رہا تھا۔

بورڈنگ کارڈ لے کر میں ٹرانزٹ لاؤنج میں آ گیا۔ جس وقت سپیکر پر اعلان ہوا کہ برازیل جانے والی فلائیٹ تیار ہے تو میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ گیٹ کی طرف چل پڑا۔ طیارہ جمبو جیٹ تھا۔ پورا بھرا ہوا نہیں تھا۔ ٹھیک وقت پر جہاز ڈیلس ایئرپورٹ پر سے ٹیک آف کر گیا۔ یہ کافی لمبی فلائیٹ تھی۔ واشنگٹن سے کولمبیا تک جہاز نے پورا بحر اوقیانوس عبور کرنا تھا۔ پہلا سٹاپ کولمبیا ہی تھا۔ کولمبیا تھوڑی دیر

رکنے کے بعد جہاز برازیل کے دارالحکومت برازیلیہ کی جانب پرواز کر گیا۔ جس وقت جہاز نے برازیلیہ کے رن وے کو ٹچ کیا' اس وقت شام ہو چکی تھی۔

میں ایئرپورٹ کے باہر لابی میں آیا تو وہاں مختلف لوگ پلے کارڈ لئے اپنے اپنے متعلقین کے واسطے کھڑے تھے۔ میری نگاہیں سلطان کے دوست سانگوش کے شوفر کے پلے کارڈ کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر ایک پلے کارڈ پر لکھا ہوا مجھے اپنا نام نظر آ گیا۔ اسے ایک درمیانے قد کے سانولے رنگ کے نوجوان نے اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس کے پاس جاکر کہا:

"میرا نام سلمان ہے۔"

شوفر نے خوش ہو کر انگریزی میں کہا:

"پلیز کم اون۔ پلیز۔"

پارکنگ لاٹ میں ایک طرف بلیک مرسڈیز کھڑی تھی۔ برازیل کا موسم گرم تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی برازیلیہ کی جگمگاتی عالی شان عمارتوں کے درمیان سے گذرتی کشادہ سڑکوں پر روانہ ہو گئی۔ برازیلیہ بھی واشنگٹن اور نیویارک کی طرح کا ایک ماڈرن شہر ہے۔ ہائی رائز عمارتیں ہیں۔ مگر یہاں مجھے مشرقیت نظر آ رہی تھی۔ عورتوں کا لباس مغربی تھا مگر ان کے چہرے کے نقش و نگار مشرقی سے تھے۔ گاڑی مختلف علاقوں میں سے گذرنے کے بعد ایک بہت بڑی کمرشل بلڈنگ کے پورچ میں جاکر کھڑی ہو گئی۔ سامنے پہلی منزل کے برآمدے میں نیلے رنگ کے انگریزی حروف میں سانگوش ایم پورنیم کا بورڈ لگا تھا۔

یہ سانگوش کے نوادرات کا شوروم تھا جو رات کے نو بجے تک کھلا رہتا تھا۔ سانگوش چوڑے جبڑے چوڑے شانوں والا درمیانے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ گردن تک آئے ہوئے بالوں میں کہیں سفید بال جھلک رہے تھے۔

اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری چمک تھی۔ رنگ زردی مائل سانولا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے انگریزی فلموں کے ریڈ انڈین یاد آ گئے۔

مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے سانگوش نے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرا جائزہ لے رہا ہو۔ اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ ریڈ انڈینوں والا تھا۔

"میرے دوست سلطان نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔ تم کیا پیو گے؟"

میں اس کی شاندار میز کے گرد کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کافی ٹھیک رہے گی۔"

سانگوش نے ملازم سے کافی لانے کو کہا۔ وہ میری طرف مسلسل دیکھ رہا تھا اور مجھے اس کے اس طرح دیکھنے سے الجھن محسوس ہونے لگی تھی۔

"سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں۔ لمبا سفر تھا بس۔"

"ہوں۔"

پھر وہ فون پر کسی سے کاروباری گفتگو کرنے لگا۔ کافی آ گئی۔ میں بھی کسی وقت سانگوش کا جائزہ لے لیتا تھا۔ یہ آدمی صاف گو اور دلیر لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی چوڑے اور انگلیاں مضبوط تھیں۔ اس نے قیمتی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔

ریسیور رکھ کر اس نے مجھے امریکی سگریٹ پیش کیا۔ میں نے بالکل نہ کہا کہ مجھے یہ سگریٹ پسند نہیں ہیں۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ سانگوش نے مجھ سے میری فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ شاید وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میری پرورش کس قسم کے ماحول میں ہوئی ہے۔ کہنے لگا:

"تم میرے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا پسند کرو گے؟"

میں نے کہا:۔ "میں کہیں بھی ٹھہر سکتا ہوں۔ میں کافی سخت جان ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ مگر اسکی مسکراہٹ خفیف تھی۔

"تمہاری عمر کے نوجوان کو سخت کوش ہونا چاہئے۔ میں جب تمہاری عمر کا تھا تو جنگل میں خود جا کر لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتا تھا۔ ویسے میرے مکان میں دو تین گیسٹ ہاؤس ہیں۔ ڈبل بیڈ روم والے بھی ہیں اور سنگل بیڈ روم والے بھی۔ تم جیسا چاہو' اپنے لئے پسند کر سکتے ہو۔"

کوئی نو بجے رات میں سانگوش کے ساتھ اس کے شوروم سے نکلا۔ وہ مجھے خود ڈرائیو کر کے اپنے شاندار مکان پر لے گیا۔ مکان چھوٹا سا محل لگتا تھا۔ پورچ میں روشنی ہو رہی تھی۔ برآمدے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے پودوں کے گملے سجے ہوئے تھے۔ اس کے مکان پر ہی میں نے کھانا کھایا۔ پھر وہ مجھے اپنے مکان کے پیچھے لے گیا۔ جہاں دو تین انیکسیز بنی ہوئی تھیں۔ یہ مہمان خانے تھے۔ میرے لئے سنگل بیڈ روم والا سویٹ کھول دیا گیا۔ دو کمرے تھے۔ ہر قسم کی سہولت کا سامان موجود تھا۔ کہنے لگا:

"صبح میرا دفتر اور شوروم بند رہے گا۔ کل ہم نیشنل پارک دیکھنے چلیں گے۔ وہاں کافی بھی پئیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔ اس وقت تم جیٹ جہاز کے سفر سے تھکے ہوئے ہو گے۔ جاؤ آرام کرو۔ کل دس بجے دن ملاقات ہو گی۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کارنس کے شیلف میں شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ کاؤنٹر پر کچھ گلاس پڑے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹا سا گھریلو خانہ تھا۔ مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کپڑے بدل کر سو گیا۔

دوسرے دن کافی دیر تک سویا رہا۔ بارہ ایک بجے اٹھا۔ ملازم نے بتایا سانگوش باس کا دو بار فون آ چکا ہے۔ میں نے اسے فون کیا۔ یہ بنگلے کے اندر ہی فون کا سسٹم تھا۔ یعنی انٹر کام سسٹم تھا۔ دوسری طرف سے سانگوش کی سنجیدہ اور بھاری آواز سنائی دی۔

"میرا ارادہ ہے کہ ہم کوئی ایک گھنٹے بعد چڑیا گھر دیکھنے جائیں۔ ایک بجے کے بعد وہاں رش نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہارے پاس آجاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

ایک گھنٹے بعد سانگوش آگیا۔ ہم برازیلیا شہر کے مشہور نیشنل پارک میں آگئے۔ کافی بڑا نیشنل پارک تھا۔ ہر قسم کے جانور اور درندے موجود تھے۔ اور گراؤنڈوں میں ادھر ادھر کھلے پھر رہے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے گاڑی کو آگے چلاتے ہوئے دن کا نظارہ کر رہے تھے۔ سانگوش خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک خالی جگہ پہنچ کر سانگوش نے سڑک سے ہٹ کر گاڑی درختوں کے نیچے کھڑی کر دی اور انجن بند کر کے بولا:

"یہاں ہم تنہائی میں باتیں کر سکیں گے۔ ہمارے گفتگو سننے والا یہاں کوئی نہیں ہو گا۔"

اس نے تھرموس سے کافی ایک گتے کے کپ میں ڈال کر مجھے دے دی۔ ایک کپ اپنے پاس رکھ لیا۔ بات شروع کرتے ہوئے کہنے لگا:

"میرے دوست سلطان نے مجھے یقین دلایا ہے کہ تم قابل اعتماد آدمی ہو اور کسی سے کوئی بات نہیں کرو گے۔ کیا یہ ٹھیک بات ہے؟"

میں نے کہا:۔ "باقی معاملوں میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مدفون خزانوں کے بارے میں میں نے قسم کھائی ہوئی ہے۔ اس لئے آپ کو میری طرف سے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ یہ راز مرتے دم تک میرے سینے میں دفن رہے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ لیکن ابھی تم کچھ روز یہاں رہو گے۔ اس کے بعد ہم اپنی مہم پر روانہ ہوں گے۔"

میں وہاں رہنے لگا۔ میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ دو ہفتے گذر گئے۔ سانگوش مہم پر جانے کا ذکر ہی نہیں کرتا تھا۔ شاید وہ میرے صبر اور برداشت کا امتحان لے رہا تھا۔ میں نے بھی اس سے کوئی تکرار نہ کی اور خاموش رہا۔ جب بیس روز اسی طرح بیکار بیٹھے گذر گئے تو ایک رات کھانے پر سانگوش نے اچانک بتایا:

"ہم پرسوں مہم پر روانہ ہوں گے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ میری پلیٹ میں مچھلی کا ٹکڑا رکھتے ہوئے بولا:

"ہمیں یہاں سے فورڈ لینڈ جانا ہو گا۔ یہ جگہ ہمارا کیمپ ہو گا۔ اس کے آگے امیزون کے گھنے جنگلات شروع ہو جاتے ہیں اور کوئی سڑک نہیں جاتی۔ آگے ہمیں خچروں کے ذریعے ماکاپو تک سفر کرنا ہو گا۔"

میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا:

"ہمیں وہاں کتنے دن لگ جائیں گے؟"

سانگوش نے مجھ پر گہری نگاہ ڈالی:

"کیا تم اس مہم سے جلدی فارغ ہونا چاہتے ہو؟"

میں نے فوراً جواب دیا:

"بالکل نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ٹائم میری پرابلم نہیں ہے۔ میں ایڈونچر سے جتنا بھی لطف اندوز ہوں کم ہو گا۔"

سانگوش نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے روز وہ اندر ہی اندر کچھ تیاریاں کرتا رہا۔ مجھ سے اس نے سفر کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ اس سفر کو وہ راز میں رکھ رہا تھا۔ اس نے دفتر میں یہی کہا کہ وہ کاروباری ٹور پر نیویارک لندن اور پیرس جا رہا ہے۔ جس روز ہمیں مہم پر روانہ ہونا تھا' اس روز اس نے مجھے پہلے ہی برازیلیا ایئرپورٹ پر جا کر پارکنگ لاٹ میں انتظار کرنے کو کہا۔ اس نے مجھے اپنی گاڑی بھی نہ

دی۔ میں ٹیکسی پر منہ اندھیرے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد سانگوش بھی آگیا۔ وہ اپنی گاڑی میں آیا تھا۔ اس نے وہیں سے ڈرائیور کو واپس بھیج دیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سوٹ کیس لایا تھا۔ اس نے دو روز پہلے میری اور اپنی دو سیٹیں جہاز میں بک کروا رکھی تھیں۔ ہم اندرون ملک پرواز والے ایک چھوٹے طیارے میں سوار ہوگئے۔ برازیلیہ سے فورڈ لینڈ تک کی پرواز ڈیڑھ گھنٹے کی تھی۔ یہ ایک شمالی برازیل کے جنگلاتی علاقے کا ایک چھوٹا سا شہر نما قصبہ تھا۔ ہم نے فورڈ لینڈ کے ایئرپورٹ سے نکل کر ٹیکس لی اور قصبے سے باہر کافی دور جاکر سانگوش نے ایک کاٹیج کے گیٹ پر ٹیکسی رکوائی۔ سوٹ کیس اتروایا اور ٹیکسی والے کو واپس بھیج دیا۔ کہنے لگا:

"یہ میرا سمرہاؤس ہے۔ یہاں میں اپنی مہم کے دوران آکر ٹھہرتا ہوں۔ مسٹر سلطان بھی یہاں میرے ساتھ آچکا ہے۔ یہاں سے ہم کل صبح کے وقت خچروں پر ماکاپو کی طرف روانہ ہوں گے۔"

کاٹیج دیہاتی ٹائپ کا تھا مگر اس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ رات ہم نے گذاری۔ رات کو ہی سانگوش نے خدا جانے کس کو فون کرکے کہا تھا کہ وہ تین خچر لے کر صبح صبح پہنچ جائے۔ اگلے روز صبح صبح ایک ریڈ انڈین دیہاتی تین خچر لے کر آگیا۔ سانگوش اور میں اس سے پہلے بیدار ہوکر تیار ہوچکے تھے۔ اس نے سوٹ کیس، دو رائفلیں اور ایمونیشن اور خنجر وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہم نے نکال کر اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ ہم نے خاکی رنگ کی شرٹیں اور اسی رنگ کی تنگ پتلونیں اور پنڈلیوں تک اونچے بوٹ پہن رکھے تھے۔ سروں پر کپڑے کے ہیٹ تھے۔ سانگوس نے کمر کے گرد ایک پستول بھی لگالیا تھا۔ ایک جھولے میں کھانے پینے کا سامان اور گیس کا چولہا اور گیس کا لیمپ اور تہہ کیا ہوا خیمہ اور بستر وغیرہ تھا۔ یہ سارا سامان ایک خچر پر لاد دیا گیا۔

سامان والے خچر پر وہ آدمی بیٹھ گیا جو خچر لایا تھا۔ ایک خچر پر میں اور ایک خچر پر سانگوش سوار ہوگئے اور ہماری مختصر سی مہم جو قافلہ پچھلے پہر کے نیم اندھیرے میں ماکاپا کی طرف ایک پتلی سی سڑک پر چل پڑا۔ سانگوش نے مجھے بتایا تھا کہ ہم ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد ماکاپا پہنچیں گے۔

جس وقت سورج نکلا تو ہم ایمزون کے قدیم پراسرار اور گھنے جنگلوں میں داخل ہوچکے تھے۔ سانگوش کا خچر مجھ سے آگے تھا۔ پیچھے وہ خچر تھا جس پر سامان لدا ہوا تھا۔ سانگوش نے خچروں کے مالک کو فورڈ لینڈ میں ہی رخصت کردیا تھا۔ ہم جنگل کی ایک پگ ڈنڈی پر چلے جارہے تھے۔ دونوں جانب اونچے اونچے درخت تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ کہیں کوئی جوہڑ آجاتا جہاں مجھے دو تین مگرمچھ کیچڑ میں خاموش لیٹے ہوئے نظر آئے۔ سانگوش نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا:

"یہ مگرمچھ انسان پر حملہ نہیں کرتے۔ مگر شکاری ان کو ہلاک کرکے لے جاتے ہیں۔ ان کی کھال بازار میں بڑی مہنگی بکتی ہے۔"

دو گھنٹے چلنے کے بعد ایک نہر آگئی۔ اسکا پاٹ چوڑا تھا۔ میں اسے نہر سمجھ رہا تھا۔ سانگوش نے بتایا کہ یہ دریائے امیزون کی ایک شاخ ہے جو آگے جاکر سمندر میں گرتی ہے۔

"یہاں سے آگے مشرق کی طرف امیزون کے ڈیلٹے کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ وہاں دریا کئی شاخوں میں تقسیم ہوکر دلدلیں بناتا سمندر میں گرتا ہے۔"

سانگوش نے اپنا خچر دریا کی شاخ میں ڈال دیا۔ پانی خچروں کے پیٹ تک ہی آتا تھا۔ ہم دریا کی شاخ پار کرکے دوسری طرف والے جنگل میں داخل ہوئے۔ دوپہر تک ہم جنگل میں سفر کرتے رہے۔ ہم آہستہ آہستہ جارہے تھے۔ کیونکہ راستہ دشوار گذار

تھا۔ دوپہر کے بعد ہم ایک جگہ خچروں سے اتر کر بیٹھ گئے۔ یہاں ہم نے وہ کھانا جو ساتھ لائے تھے کھایا اور آرام کرنے لگے۔ سانگوش کہنے لگا:

"جس پہاڑی سرنگ میں میں اور سلطان قبروں میں سے سونا اور ہیرے جواہرات نکالتے رہے ہیں۔ اب وہ خالی ہو چکی ہیں۔ اس وقت ہم اسی پہاڑی سلسلے کی ایک اور سرنگ میں جانے والے ہیں۔ میں نے اپنی پڑدادی کی زبانی سنا ہے کہ ہمارے سب سے پرانے بزرگ انڈین سردار کی لاش اسی سرنگ میں دفن ہے۔ اگر ہمیں یہ قبر مل گئی تو کافی دولت ہمارے ہاتھ آئے گی۔"

وہ سگار پی رہا تھا۔ کہنے لگا:

"ایک بات کا خیال رکھنا۔ ہمارے آباءواجداد سورج دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ یہ خزانہ سورج دیوتا کی امانت ہے۔ اگر ہمارے خاندان کے بزرگ سردار کی قبر مل گئی تو تم کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ نہیں تو سورج دیوتا کی بددعا کا شکار ہو جاؤ گے۔ میرا تعلق انڈین قبیلے سے ہے اور یہ خزانہ ہمارے بزرگوں کو نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے۔ اسی لئے مجھے سورج دیوتا کی بددعا نہیں لگے گی۔"

میں دل میں سوچنے لگا کہ کہیں یہ شخص سارا خزانہ خود ہی تو ہڑپ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو مجھے ہر کام اس کی مرضی کے مطابق کرنا تھا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی خزانہ مل گیا تو یہ شخص اپنے وعدے کے مطابق اسکا چوتھا یا تیسرا حصہ مجھے ضرور دے دے گا۔ یہ انڈین قبیلے کے لوگ اپنی بات اور اپنے قول کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم دوبارہ کٹھن سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور جنگل کا پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ کبھی اونچائی آجاتی۔ کہیں

ڈھلان آجاتی۔ مگر زیادہ اونچی پہاڑیاں نہیں تھیں۔ راستے میں کئی جوہڑ اور دلدلی میدان آئے۔ سانگوش مجھے دلدل دکھا کر کہتا:

"دیکھو اوپر سے سبزہ دکھائی دے رہا ہے۔ اناڑی آدمی اسے گھاس کا میدان سمجھ کر اس پر چل پڑتا ہے۔ مگر اس کے نیچے کتنی خطرناک دلدل ہے یہ اسے اس وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ گھٹنوں تک دلدل میں دھنس چکا ہوتا ہے۔"

میں نے دلچسپی کی خاطر پوچھا:

"آخر دلدل میں سے نکلنے کا کوئی طریقہ تو ہو گا۔"

سانگوس کہنے لگا:

"صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی اوپر درخت کی کسی شاخ کو پکڑ کر درخت پر چڑھنے کی کوشش کرے۔ یا کنارے پر سے کوئی رسہ اسکی طرف پھینک دے اور جلدی جلدی کھینچنا شروع کر دے۔۔۔"

"اور اگر یہ دونوں چیزیں میسر نہ ہوں تو۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

سانگوش بولا:۔

"پھر دلدل اس شخص کو دیکھتے دیکھتے نگل جائے گی۔ ہاں البتہ ایک کوشش کی جا سکتی ہے۔ آدمی کو جب معلوم ہو جائے کہ وہ دلدل میں پھنس چکا ہے تو فوراً اپنے اوپر کو منہ کے بل دلدل کے اوپر گرا دے جس طرح آدمی دریا میں تیرتا ہے۔ اس میں بھی بچاؤ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک تو دلدل پتلی ہو' دوسرے دلدل اوپر نیچے نہ ہو رہی ہو۔ امیزون کے ان جنگلوں میں ایسی دلدلیں بھی ہیں جن کا کیچڑ آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ اسے ریڈ انڈین کی زبان میں سانس لینے والی دلدل کہتے ہیں۔ یہ دلدل انسان کو دو تین سیکنڈ میں نگل لیتی ہے۔"

میں نے ادھر ادھر درختوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"میں نے سن رکھا ہے کہ ایمزون کے جنگلوں میں ایسے درخت بھی ہوتے ہیں جو آدمی کا خون چوستے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

سانگوش بولا:

"سو فیصد سچ ہے۔ یہ خونی درخت ہوتے ہیں۔ ان کی شاخیں لٹکتی رہتی ہیں اور زمین کو چھو رہی ہوتی ہیں۔ ان شاخوں کو انسان' جانور اور کیڑے مکوڑوں کے خون کی بو آجاتی ہے۔ جیسے ہی کوئی انسان یا درندہ ان سے چند انچ کے فاصلے پر آتا ہے' شاخیں جال کی طرح اس پر گرتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے اسے جکڑ کر اسکا خون پینا شروع کر دیتی ہیں۔ جب انسان کا سارا خون پی لیتی ہیں تو اپنی گرفت ڈھیلی کر کے اس بدنصیب کی لاش زمین پر پھینک دیتی ہیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

"اگر ہمارے راستے میں ایسا درخت آگیا تو۔۔۔؟"

سانگوش نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا:

"ایمزن کے جنگل میرے جانے پہچانے ہیں۔ میں ان کے تمام اسرار جانتا ہوں۔ میں انہی جنگلوں میں چل پھر کر بڑا ہوا ہوں۔ بلکہ میرے آباء واجداد بھی انہی جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ ان جنگلوں کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے آدم خور درخت جنگل کے کس علاقے میں ہوتے ہیں۔ ہم اس علاقے سے ہٹ کر سفر کر رہے ہیں۔"

جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو سانگوش نے خچر روک لیا اور بولا:

"ہم یہیں رات گذاریں گے۔"

جنگل میں یہ تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ ایک طرف چھوٹے سے ٹیلے کی ڈھلان تھی جو جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور بڑے خوش نما سرخ اور زرد پھول کھلے ہوئے

تھے۔ اوس بھی گرنے لگی تھی۔ ہم نے یہاں نائیلون کا زرد رنگ کا خیمہ کھول کر لگا دیا۔ اندر بستر بچھا دیا۔ سانگوش نے باہر آگ کا الاؤ روشن کر کے گیس کا لیمپ جلا کر ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا۔ اس کے بعد اس نے جھولے میں سے ایک پلاسٹک کا لفافہ نکال کر کھولا۔ اس میں سفید رنگ کا سفوف تھا۔ یہ سفوف اس نے آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔ چاروں طرف عجیب سی ناگوار بو پھیل گئی۔ سانگوش نے کہا:

"یہ لمبی تھوتھنی والے عمر رسیدہ مگرمچھ کچربی کا سفوف ہے۔ اس کی بو ساری رات اس جنگل میں پھیلی رہے گی۔ سانپ' بچھو اور شیر اور بھیڑیئے اس بو سے دور بھاگتے ہیں۔ ہم بے فکر ہو کر سو سکتے ہیں۔"

ہم الاؤ کے قریب بیٹھے ٹین کے مگوں میں کافی ڈال کر پی رہے تھے۔ کھانا ہم نے کھا لیا تھا۔ سانگوش نے صندوق میں سے گٹار نکال لی اور اسے بجاتے ہوئے عجیب سی آواز میں اپنے قبیلے کا کوئی گیت گانے لگا۔ جب وہ گیت گا چکا تو میں نے کہا:

"اس گیت کا مطلب کیا تھا؟"

سانگوش نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے بتایا:

"یہ ہمارے قبیلے کا ایک فوک سانگ ہے۔ یہ ایک بہن کا نوحہ ہے جو اپنے بھائی کو یاد کر رہی ہے۔ اس کا بھائی دو قبیلوں کی لڑائی میں مارا گیا ہے اور وہ اسی کو یاد کر کے کہتی ہے۔ میرے دلیر بھائی! میں نے تمہارے لئے مچھلی بھون کر رکھی ہے۔ کیا تم اسے کھانے نہیں آؤ گے؟ میرے بھائی! میں روز صبح دریا کے ساحل پر جاتی ہوں کہ شاید تم اپنی کشتی میں سوار مچھلیاں پکڑ کر گھر آرہے ہو گے۔ میرے بھائی! تم اپنی بہن سے اتنی دور کیوں چلے گئے ہو کہ جہاں سے واپس آنا مشکل ہے۔۔۔۔"

سانگوش اداس ہو گیا۔ گیت واقعی اداس کر دینے والا تھا۔ اس میں اپنے بھائی کے لئے ایک بہن کے پیار کا شدید جذبہ تھا۔ الاؤ کی آگ کے شعلے ختم ہو چکے تھے۔

صرف انگارے دہک رہے تھے۔ مگر مچھ کے سفوف کی بو اب بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے چھوٹے سے نائیلون کے خیمے کے باہر ہی گھاس پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد سانگوش خراٹے لینے لگا۔ وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ مجھے ایک تو مگر مچھ کے سفوف کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی دوسرے یہ خوف تھا کہ کسی طرف سے سانپ یا بچھو یا کوئی درندہ نہ نکل آئے۔ مجھے سانگوش کے مگر مچھ کے سفوف پر زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ ایمزن کے جنگلوں کے بارے میں میں نے رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ ان جنگلوں میں ایسے درخت بھی ہیں جو رات کو سوتے ہوئے آدمیوں کو اپنی ٹہنیاں جھکا کر اوپر کھینچ لیتے ہیں اور ان چیونٹیوں کے حوالے کر دیتے ہیں جو ان درختوں میں رہتی ہیں اور جو آدمی کو ایک منٹ میں چٹ کر جاتی ہیں۔

خچر پر سفر کرنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا اور میری کمر بھی درد کر رہی تھی۔ پھر بھی میں کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور نیند کی دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر گذرنے کے بعد مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں ابھی اسی حالت میں تھا کہ مجھے ایسی آواز آئی جیسے کوئی جانور جھاڑیوں میں سے نکل کر بھاگا ہو۔ میرے اوپر درختوں کی چھتریاں تنی ہوئی تھیں۔ اچانک آدمیوں کے دوڑنے کی آواز آئی۔ اور اس سے پہلے کہ میں اٹھوں، چھ سات آدمیوں نے مجھے آدبوچا۔ اور ایک طرف گھسیٹنے لگے۔ میں نے سانگوش کو آواز دی۔ اندھیرے میں مجھے ان آدمیوں کے نیم عریاں بدن سایوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ سانگوش نے میرے کہنے پر گیس لیمپ بجھا دیا تھا۔ کیونکہ مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ سانگوش کو بھی کچھ آدمیوں نے پکڑ رکھا تھا اور اسے بھی گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔

ایک دم سے سانگوش نے ایک خاص انداز میں آواز نکالی۔ اس آواز نے جادو کا اثر کیا۔ یہ سارے آدمی جو جنگلی لوگ لگتے تھے، وہیں رک گئے۔ انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے سانگوش کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ سانگوش نے ان لوگوں کی زبان میں بلند آواز میں کچھ کہا۔ وہ لوگ وہیں زمین پر بیٹھ گئے اور دونوں بازو زمین پر پھیلا کر خدا جانے کس زبان میں ایسی آوازیں نکالنے لگے جیسے کسی دیوتا کی پوجا کر رہے ہوں۔ سانگوش سیدھا کھڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے کہا:۔ "میرے قریب آجاؤ۔"

میں دوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔ سانگوش نے گیس لیمپ روشن کر دیا۔ اس کی روشنی میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سارے کے سارے ریڈ انڈین ہیں۔ ان کے جسموں پر سرخ اور زرد رنگ کی لکیریں تھیں اور تیر کمان کاندھوں سے لٹک رہے تھے۔ سانگوش نے ان لوگوں کو کچھ کہا۔ سارے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ سانگوش ان میں سے ایک آدمی کے ساتھ ریڈ انڈین قبیلے کی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ سارے ریڈ انڈین بار بار جھک جھک کر سانگوش کو سلام کرتے ہوئے جنگل کے درختوں میں غائب ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد سانگوش کہنے لگا:

"یہ کماچو قبائل کے ریڈ انڈین تھے۔ یہ جنگل میں سفر کرنے والے اجنبی ملک کے لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور ان کے سر کاٹ کر ان کو چھوٹا کر کے گلے میں ڈال لیتے ہیں۔"

میرے واقعی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سانگوس کی وجہ سے اس نے میری جان بچالی۔ ہم الاؤ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟"

میں نے کہا:۔ "نہیں۔ صرف ایک گھٹنا تھوڑا سا چھل گیا ہے۔"

سانگوس نے گیس لیمپ روشن کر دیا اور میرے چھلے ہوئے گھٹنے پر اندر سے ڈیٹول نکال کر لگائی۔ کہنے لگا:

"اسی لئے میں گیس لیمپ نہیں بجھانا چاہتا تھا۔ روشنی میں انہیں میرا چہرہ نظر آجانا تھا۔ وہ میرا ریڈ انڈین والا چہرہ دیکھ کر کبھی یہ حرکت نہ کرتے۔ اب مطمئن ہو کر سو جاؤ۔ ان لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ اس جنگل میں دوسرا کوئی قبیلہ نہیں رہتا۔"

ہم لیٹ گئے۔ سانگوش فوراً ہی سو گیا۔ مگر مجھے کافی دیر بعد جا کر نیند آئی۔

صبح چڑیوں اور پرندوں کے بولنے کی آوازوں نے مجھے جگا دیا۔ درختوں میں سے دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ سانگوش پہلے ہی سے جاگ چکا تھا اور فرائی پین میں انڈے فرائی کر رہا تھا۔

"کہو۔ رات کو کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں آیا؟"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی ایک تالاب تھا۔ وہاں جا کر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ پھر سامان سمیٹ کر جھولے میں رکھا۔ خیمہ تہہ کر کے اسے سوٹ کیس میں بند کیا ہمارے خچر قریب ہی درختوں کے نیچے کھڑے تھے۔ ایک خچر پر سوٹ کیس اور جھولا رکھا اور اپنے اپنے خچروں پر بیٹھ کر ہم اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل زیادہ گھنا اور دشوار گذار ہو رہا تھا۔ مگر سانگوس خچروں کو ایک ایسے راستے سے لے جا رہا تھا جہاں جھاڑیوں کے درمیان نظر نہ آنے والی پگڈنڈی تھی۔ یہاں ہم خچروں سے اتر آئے تھے اور ان کی باگیں تھامے ایک دوسرے کے آگے پیچھے پیدل چل رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک تھوڑی سی کھلی جگہ آگئی۔ سانگوش رک گیا تھا اور جھک کر زمین پر اگی ہوئی گھاس کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب آیا تو مجھے گھاس دکھاتے ہوئے بولا:

"یہ دیکھو۔ کتنی ہری بھری گھاس ہے۔"

واقعی گھاس بڑی سرسبز تھی۔ کہنے لگا:

"لیکن اس کے نیچے بڑی خوفناک دلدل ہلچل مچا رہی ہے۔"

اس نے ایک طرف درخت کا گرا ہوا تنا اٹھا کر گھاس میں پھینکا۔ میرے دیکھتے دیکھتے گھاس نے تنے کو نگل لیا۔ میں نے سوچا کہ اتفاق سے اگر میں اکیلا جنگل سے گذر رہا ہوتا تو میں اس ہری بھری گھاس پر ضرور چلنے لگتا اور پھر میرا وہی حشر ہوتا جو درخت کے ٹوٹے ہوئے تنے کا ہوا جس کو نگلنے کے بعد دلدلی گھاس دوبارہ ساکت ہو گئی تھی۔

اسی طرح ہم جنگل میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ دوپہر کے بعد جا کر کہیں یہ جنگل ختم ہوا اور دریا کی ایک اور شاخ راستے میں آگئی۔ اسے بھی ہم نے خچروں پر بیٹھ کر پار کیا۔ آگے ایک اونچا نیچا گھاس کا میدان دور پہاڑیوں تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ سانگوش نے کہا:

"ہم یہاں تھوڑی دیر آرام کریں گے۔"

ہم خچروں سے اتر آئے اور انہیں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ ہم دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔ سانگوش نے تھیلے میں سے لنچ کے دو پیکٹ نکال لئے۔ ہم روسٹ بیف کے برگر کھانے لگے۔ پلاسٹک کی بوتلوں میں سے پانی پیا۔ سانگوش نے سگار سلگا لیا۔ دور پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا:

"ہمیں ان پہاڑیوں میں جانا ہے۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو کوئی منزل تو سامنے نظر آئی۔ ویسے میں اس دشوار گذار جنگل کے سفر میں بڑا ایڈونچر محسوس کر رہا تھا۔ یہ بھی پتہ تھا کہ آگے خزانہ ملنے والا ہے۔ پورا خزانہ نہ سہی مگر تھوڑے بہت قیمتی پتھر اور سونے کے دو چار زیور ملنے کی تو پوری امید تھی۔ اور جیسا کہ سانگوش نے بتایا تھا اگر تیسری پہاڑی کی

سرنگ میں ہمیں اس کے خاندان کے بزرگ سردار کی قبر مل جاتی ہے تو پھر تو ہمارے ہاتھ بڑا زبردست قیمتی خزانہ لگنے والا تھا۔

سانگوش کہہ رہا تھا:

"پہلے ان پہاڑیوں کی گورنمنٹ کی طرف سے نگرانی کی جاتی تھی اور ایک گارڈ پوسٹ بنی ہوئی تھی۔ مگر جب سے قبریں خزانوں سے خالی ہوگئی ہیں اور سرکار نے یہ قبریں عام لوگوں کے لئے کھول دی ہیں' تب سے یہاں سے گارڈز پوسٹ اٹھالی گئی ہیں۔"

"کیا لوگ اب بھی یہاں سونے اور قیمتی پتھروں کی تلاش میں آتے ہیں؟"

"نہیں۔ نہ ہونے کے برابر۔ بلکہ جہاں تک مجھے ملنے والی اطلاعات کا تعلق ہے اب لوگوں نے بھی ادھر آنا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ واقعی پہلی دو سرنگوں میں اب سوائے خالی قبروں کے گڑھوں اور مردوں کی ہڈیوں کے اور کچھ باقی نہیں بچا۔"

"کیا تیسری سرنگ کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں گیا؟" میں نے پوچھا۔

سانگوش بڑے مزے سے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے منہ میں سگار دبائے ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا۔ کہنے لگا:

"کسی کو تیسری سرنگ کا علم ہی نہیں ہے۔ یہاں کے ریڈ انڈین قبیلے کو بھی شاید ہی اسکا پتہ ہو۔ اس سرنگ کا نقشہ صرف ہمارے خاندان میں سینہ بسینہ چلا آرہا ہے۔ کیونکہ وہاں جو بزرگ سردار دفن ہے وہ ہمارے قبیلے کا جد امجد ہے۔"

"کیا تم پہلے وہاں کبھی گئے ہو؟"

سانگوش بولا:

"دو تین بار جا چکا ہوں۔ ایک بار مجھے میرا بوڑھا والد مجھے لے گیا تھا۔ اس نے مجھے ہمارے جد امجد کی سرنگ میں قبر دکھائی تھی۔ دوسری بار میں اکیلا گیا تھا۔"

"اگر تمہیں تمہارے بزرگ سردار کی قبر مل گئی اور اس میں خزانہ بھی ہوا تو کیا اس بات کا ڈر نہیں ہوگا کہ ہمیں بزرگ سردار کی روح کی بددعا لگ جائے گی؟"

"میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اگر میں خزانہ نکالوں گا تو بزرگ سردار کی روح مجھے بددعا نہیں دے گی۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں ان کے ہی خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔"

دس پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد ہم وہاں سے آگے چل پڑے۔

جو پہاڑیاں ہمیں قریب دکھائی دیتی تھیں، وہ اصل میں کافی دور تھیں۔ ہم گھاس کی میدانی وادی میں سورج کے غروب ہونے تک خچروں پر سفر کرتے رہے۔ تب کہیں جاکر ہم ماکاپا کے گاؤں یا چھوٹے سے مقامی قصبے میں پہنچے۔ یہ بانس کی جھونپڑیوں کی آبادی تھی جو ایک ٹیلے کے دامن میں آباد تھی۔ یہاں کے لوگ مقامی بھی تھے اور ریڈ انڈین بھی تھے جو جنگل کی وحشی زندگی کو ترک کر کے قصبے میں آکر آباد ہوگئے تھے اور کھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔ ایک چٹان پر آگ روشن تھی۔ سانگوش نے مجھے بتایا:

"یہ لوگ سورج کے غروب ہونے کے بعد اونچی جگہ پر آگ روشن کر دیتے ہیں جو ساری رات روشن رہتی ہے۔ صبح کے وقت گاؤں کا بزرگ آکر آگ پر پانی چھڑک کر اسے بجھا دیتا ہے۔ اس طرح انہیں یقین رہتا ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد آگ کی شکل میں ان کے پاس آگیا ہے۔"

اس گاؤں سے ذرا فاصلے پر سے ہو کر ہم آگے نکل گئے۔ سانگوش کہنے لگا:

"میں یہاں کسی کو اس شک میں نہیں ڈالنا چاہتا کہ ہم کسی مدفون خزانے کی تلاش میں جا رہے ہیں۔"

ہم ٹیلے کے پیچھے سے ہو کر ماکاپا گاؤں سے کافی آگے تک چلے گئے۔ اب ہم ان پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے تھے جن میں سے کسی ایک پہاڑی کی سرنگ میں بقول سانگوش اس کے بزرگ سردار کی قبر تھی اور قبر میں بے بہا خزانہ تھا۔ کسی لمحے مجھے

خیال آتا کہ میں یونہی سلطان کی باتوں میں آکر احمقوں کی طرح ایمزن کے خطرناک جنگلوں میں نکل آیا ہوں لیکن چونکہ میں اس ایڈونچر سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا اور مجھے برازیل کے پراسرار جنگلوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس لئے میری دلچسپی برقرار تھی۔ لیکن یہ ڈر بھی لگا ہوا تھا کہ اگر کسی مصیبت میں پھنس گیا تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔

سورج پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ وادی پر اندھیرا گہرا ہو گیا۔ میں نے سانگوش سے کہا:

"اس اندھیرے میں ہم بھٹک تو نہیں جائیں گے؟"

ہم خچروں سے اتر کر پیدل چل رہے تھے۔ وہ بولا:

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اندھیرے میں بھی تیسری پہاڑی کی سرنگ تک پہنچ جاؤں گا۔"

یہ چھوٹی چھوٹی تین پہاڑیاں ساتھ ساتھ لگ کر کھڑی تھیں۔ سانگوش آگے آگے چل رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے درختوں کو غور سے دیکھا۔ پھر چل پڑا۔ وہ سرنگ کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ آخر اس نے سرنگ کا سراغ لگا لیا۔ کہنے لگا:

"وہ سامنے بانس کے جھنڈ دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

سانگوش نے کہا:

"ان کے پیچھے تیسری سرنگ کا دہانہ ہے، میرے ساتھ آؤ۔"

ہم نے بانس کے جھنڈوں کے عقب میں جاکر تینوں خچر کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ یہ خچر ایسے سدھائے ہوئے تھے کہ کہیں نہیں جاتے تھے۔ وہیں ادھر ادھر گھاس وغیرہ چرتے رہتے تھے۔ سانگوش نے وہاں ایک طرف پہاڑی کی اوٹ میں نائیلون کا خیمہ

کھول کر لگادیا۔ یہ خیمہ ایسا تھا کہ کوئی بچہ بھی اسے لگا سکتا تھا۔ چھوٹا سا تھا۔ بمشکل دو آدمی اس کے اندر لیٹ سکتے تھے۔ بکس اور تھیلا ہم نے خیمے کے اندر رکھ دیا۔ سانگوش نے لمبا چاقو' پستول اور ایک بڑی ٹارچ لے لی۔ خیمے کے دروازے کو زپ چڑھا کر بند کر دیا۔

"آجاؤ۔"

ہم بانس کی جھکی ہوئی شاخوں کو پرے ہٹاتے پہاڑی کی دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں بظاہر کسی غار کا دہانہ مجھے نظر نہ آیا۔ سانگوش خنجر کا دستہ دیوار پر آہستہ آہستہ مارنے لگا۔ ضرب لگا کر وہ غور سے سنتا۔ ایک جگہ کھوکھلی آواز آئی۔ سانگوش نے پہاڑی ڈھلان والی دیوار کو اس جگہ سے کھرچنا شروع کر دیا۔ مٹی نیچے گر رہی تھی۔ میں ٹارچ کی روشنی ڈال رہا تھا۔ نیچے سے ایک بڑا پتھر نمودار ہوا۔ سانگوش اس کے کناروں پر سے مٹی ہٹانے لگا۔ اس نے پتھر کی سل کو زور سے اندر کی طرف دھکیلا۔ دو تین بار دھکیلنے سے پتھر کی سل اپنی جگہ سے ہل گئی۔ اس کے بعد وہ اندر کی طرف گر پڑی۔ سانگوش نے مجھے ایک طرف کر دیا اور خود بھی ایک طرف ہو گیا۔ غار کا منہ ظاہر ہو گیا تھا۔ یہ ایک شگاف تھا جس میں سے مجھے گرم ہوا آتی محسوس ہوئی۔

سانگوش بولا:۔"لمبا سانس نہ لینا۔"

میں نے سانس ہی روک لی۔ دس پندرہ سیکنڈ گذر جانے پر سانگوش غار کے دہانے کے قریب آگیا اور ہلکی سانس لینے کے بعد بولا:

"آجاؤ۔ اندر کوئی زہریلی گیس نہیں ہے۔"

ٹارچ سانگوش نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور ہم غار میں داخل ہو گئے۔ غار کی فضا سخت حبس آلود تھی۔ عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارا دم ساگھٹ رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ہمیں غار کی چھت سے لٹکے ہوئے جالے اور زمین پر بکھرے ہوئے

روڑے پتھر نظر آنے لگے۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ سرنگ کی چھت بھی اونچی تھی اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے' وہ کشادہ ہوتی جارہی تھی۔ ایک جگہ سرنگ گھوم گئی۔ یہاں چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ سرنگ میں ہم چلتے جارہے تھے۔ سرنگ کبھی بائیں طرف گھوم جاتی کبھی دائیں طرف گھوم جاتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سرنگ ساری پہاڑی کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔ ابھی تک ہمیں کوئی قبر نظر نہیں آئی تھی۔ سانگوش نے کہا:

"صاف لگ رہا ہے کہ اس سرنگ میں ابھی تک کوئی انسان داخل نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے سردار کا خزانہ قبر میں محفوظ ہو گا۔۔۔"

میں نے دل میں کہا کہ اگر خزانہ مل گیا تب کی بات ہے۔ ابھی تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی قبر میں چل رہا ہوں۔ ایک جگہ سے سرنگ گھومی تو ہمیں ٹارچ کی روشنی میں لکڑی کے کچھ تختے نظر آئے۔ سانگوش نے خوش ہو کر کہا:

"سلمان! ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ وہ مقدس تختے ہیں جن پر ہمارے بزرگ سردار کی لاش کو دفن کرنے کے لئے لایا گیا تھا۔ ہمارے قبیلے میں یہ دستور ہے کہ سردار کو جس چارپائی یا تختوں پر ڈال کر لایا جاتا ہے وہ تختہ یا چارپائی بھی قبر کے پاس ہی رکھ دی جاتی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ سردار کی روح اس تختے یا چارپائی پر بیٹھ کر ہر روز آسمانوں کی سیر کرتی ہے۔"

مجھے سانگوش کے قبیلے کی رسومات اور توہمات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے صرف قبر میں سے نکلنے والے سونے اور قیمتی ہیرے جواہرات سے دلچسپی تھی۔ ہم اب پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ سانگوش جگہ جگہ ٹارچ کی روشنی ڈال رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے زمین پر روشنی ڈالی تو کوئی چیز چمکی۔ اس نے

جھک کر روڑوں اور پتھروں کو ادھر ادھر ہٹایا۔ وہاں سونے کی ایک بالی پڑی تھی۔ سانگوش نے بالی اٹھالی اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا:

"یہ اسی خزانے کی بالی ہے جو ہمارے بزرگ سردار کی قبر میں دفن کیا گیا تھا۔ یہ بالی تھال میں سے یہاں گر پڑی ہوگی۔"

سانگوش نے سونے کی بالی اپنے کاندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے میں رکھ لی۔ قبر کی تلاش میں ہم پھر آگے چلنے لگے۔ چند قدم بڑھے ہونگے کہ سرنگ ایکدم کشادہ ہوگئی اور ایک دالان آگیا جہاں چھت سے زمین پر چار ستون کھڑے تھے۔ ان ستونوں کے درمیان ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ سانگوش نے خوش ہوکر کہا:

"دوست! ہم سردار کی قبر پر پہنچ گئے ہیں۔"

ٹارچ کی روشنی میں قبر کے پتھر اور مٹی صاف نظر آرہی تھی۔ قبر کے سرہانے کی جانب لکڑی کا ایک بت لگا تھا۔ سانگوش کہنے لگا:

"یہ سورج دیوتا کا بت ہے۔"

میں نے کہا:۔ "کہیں سورج دیوتا تمہیں بددعا نہ دے۔"

سانگوش بولا:۔ "سورج دیوتا کو معلوم ہے کہ جس بزرگ سردار کی قبر ہے اور اس میں جو خزانہ مدفون ہے وہ ہمارا ہے۔ کیونکہ میرا تعلق بھی اسی سردار کے خانوادے سے ہے۔ اس خزانے پر میرا پورا حق ہے۔"

مجھے الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں لوگ خزانے کی تلاش میں جاتے ہیں اور جب خزانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں انسانی پنجر پڑا ہوا ملتا ہے۔ اور جب خزانہ نکالتے ہیں تو خزانے کی حفاظت کرنے والا سانپ انہیں ہلاک کر ڈالتا ہے۔ میں نے احتیاط کے طور پر سانگوش سے پوچھا:

"کہیں اس خزانے پر بھی کوئی سانپ تو نہیں بیٹھا ہوگا۔ مجھے سانپوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

سانگوش تھیلے میں سے چھوٹے بیلچے نکال رہا تھا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ کھرپی کے سائز کے بیلچے تھے۔ اس نے ٹارچ ایک جگہ اس طرح پتھروں میں رکھ دی کہ اس کی روشنی قبر پر پڑ رہی تھی۔ ایک بیلچہ مجھے تھماتے ہوئے بولا:

"ہمارے بزرگوں کے خزانے پر کوئی محافظ سانپ نہیں ہوتا۔ سورج دیوتا خود ہمارے سردار کی لاش اور اس کی ہر شے کی حفاظت کرتا ہے۔"

ہم نے بیلچوں سے قبر کو کھودنا شروع کردیا۔ قبر کے اوپر پتھر تھے مگر نیچے مٹی ہی مٹی تھی جو بھربھری ہوگئی تھی۔ ہم نے آدھ گھنٹے میں ساری قبر کھود ڈالی۔ نیچے ایک انسانی ڈھانچہ پڑا تھا مگر خزانہ کہیں نہیں تھا۔ سانگوش نے پسینہ پونچھتے ہوئے حیرانی سے کہا:۔

"یہ سردار کی قبر نہیں ہے' اگر یہ سردار کی قبر ہوتی تو اس میں خزانہ ضرور ہوتا۔"

میں نے کہا:۔ "اگر یہ سردار کی قبر نہیں ہے تو پھر اسے سرنگ میں اتنے اہتمام سے دفن کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ کہنے لگا:۔ "یقیناً یہ سردار کی کسی چہیتی بیوی کی قبر ہے۔ وہ لوگ اپنی بیویوں کی قبر میں خزانے نہیں رکھتے تھے۔ ہم غلط سرنگ میں آگئے ہیں۔"

ہم قبر سے باہر نکل آئے۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنی محنت کرنے کے بعد بھی ہمیں خزانہ تو کیا ملتا ایک ٹیڈی پیسہ بھی نہیں ملا تھا۔ حبس کے مارے ہمیں بار بار پسینہ آرہا تھا۔ میں نے کہا:

"تو پھر یہاں سے باہر نکلو۔ اس حبس اور گرمی میں اب ہمارا کوئی کام نہیں۔"

سانگوش نے ٹارچ کی روشنی میں سرنگ کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ وہاں ہمیں سوائے مکڑی کے جالوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ ہم الٹے قدموں سرنگ کے

دروازے کی طرف چل پڑے۔ اب ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ سرنگ سے باہر کھلی ہوا میں آئے تو ہم وہیں بیٹھ گئے اور تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ جب ذرا تازہ دم ہوئے تو سانگوش کہنے لگا:

"ہمارے خاندانی نقشے میں مجھے یاد ہے اسی پہاڑی کی سرنگ کا ذکر ہے۔"

ہم اٹھ کر خیمے کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ سانگوش بے چین تھا اور کسی گہری سوچ میں گم بار بار اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ آخر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلے؟" میں نے پوچھا۔

سانگوش نے کہا:۔

"یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ہمارے سردار کی قبر یہاں نہ ہو۔ اگر اس پہاڑی سرنگ میں نہیں تو ساتھ والے ٹیلے کی پہاڑی میں ہوگی۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں دوسری پہاڑی کی طرف جاتا ہوں۔ سردار کی قبر والی سرنگ ساتھ والی پہاڑی میں ہی ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا:۔" تم کب تک واپس آجاؤ گے؟"

وہ بولا:۔"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر سرنگ مل گئی تو قبر بھی مل جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ مجھے گھنٹہ آدھ گھنٹہ ہی لگے گا' تم آگ مت جلانا۔ بہتر ہے کہ خیمے کے اندر جاکر بیٹھ جاؤ۔"

وہ اندھیرے میں درختوں کی طرف چلا گیا اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی جو وہاں اکیلا رہ گیا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ ہی جانا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر خیمے کے اندر چلا گیا۔ اندر جاکر میں نے خیمے کے دروازے کی زپ چڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔ مگر اندر سخت حبس اور گرمی ہو گئی۔ میں نے زپ کھول دی اور دروازے کے بیچ میں آکر بیٹھ گیا۔

میرے سامنے بانس کے جھنڈ تھے۔ دوسری طرف ہیبت ناک اونچے اونچے درخت تھے جو رات کے اندھیرے میں بھوتوں کی مانند چپ چاپ کھڑے تھے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پستول اور خنجر بھی سانگوش اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ میرے پاس ایک چھڑی بھی نہیں تھی۔ دعائیں مانگنے لگا کہ یا اللہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میری غلطی معاف کر دینا کوئی شیر چیتا یا سانپ ادھر نہ نکل آئے۔ جنگل پر ہولناک خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی سے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جب سانگوش کو گئے کافی دیر ہو گئی تو میں اٹھ کر وہیں ٹہلنے لگا۔ لیکن میں جنگل کے بھوتوں ایسے درختوں کی طرف بالکل نہیں جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دور وہ سرنگ تھی جس میں سے ہم سردار کی بیوی کی قبر کھود کر آئے تھے۔ اس کے دہانے پر ہم نے پتھر کی سل واپس نہیں لگائی تھی۔ مجھے خواہ مخواہ وہم ہونے لگا کہ سرنگ کا منہ کھلا ہے۔ اس میں سے سردار کی بیوی کی بدروح نکل کر مجھے پکڑ لے گی۔ ہم نے قبر کو بھی دوبارہ بند نہیں کیا تھا۔

میں ڈر کر خیمے میں آکر بیٹھ گیا۔

خوف کے مارے میں نے سگریٹ بھی نہیں سلگایا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے جھاڑیوں میں کوئی چل رہا ہے۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ضرور کسی درندے نے میری بو پالی ہے۔ میں نے جلدی سے خیمے کی زپ چڑھا کر اسکا دروازہ بند کر دیا۔ جھاڑیوں کے ادھر ادھر ہونے کی آواز قریب آرہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ درندہ اگر کوئی شیر یا چیتا یا ریچھ ہے تو وہ اپنے پنجوں سے خیمے کو پھاڑ کر اندر آجائے گا۔ خیمے میں اندھیرا تھا۔ میں کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ پھر مجھے باہر آدمیوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ خوف کے مارے میرا برا حال ہونے لگا۔ اچانک خیمے کی ایک طرف کی دیوار کسی نے خنجر مار کر پھاڑ ڈالی اور تین چار آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ نیم اندھیرے میں مجھے ان کی دھندلی شکلیں نظر آئیں۔ یہ ریڈ انڈین تھے۔ ان کی آنکھیں اندھیرے

میں انگاروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی آواز نہ نکالی اور مجھے گھسیٹ کر خیمے سے باہر لے گئے۔ میں نے چیخ کر کہا:

"میں سانگوش ہوں۔ میں سانگوش قبیلے کے سردار کا دوست ہوں۔ سانگوش، سانگوش، سانگوش....."

میں بار بار اپنے دوست کا نام لے رہا تھا کہ شاید اسی سے انہیں پتہ چل جائے کہ میرا تعلق ایک ریڈ انڈین قبیلے سے ہے جس کا سبھی قبائل احترام کرتے ہیں مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دو آدمیوں نے اٹھا کر مجھے ایک گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر ڈالا اور گھوڑا ایک طرف کو تیز تیز چل پڑا۔ یہ سات آٹھ ریڈ انڈین تھے اور سبھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں نے سارا زور لگا کر سانگوش کو آواز دی۔

"سانگوش! سانگوش!"

جس ریڈ انڈین نے مجھے گھوڑے پر ڈال رکھا تھا، اس نے زور سے کوئی چیز میرے سر پر ماری۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں ایک تنگ جھونپڑے میں سوکھی گھاس کے فرش پر پڑا تھا۔ کونے میں پتھر پر رکھا ایک دیا جل رہا تھا۔ میرے سر پر جہاں ضرب لگی تھی وہاں سخت درد ہو رہا تھا اور روبڑا سا پڑ گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جھونپڑا موٹے بانسوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ چھت مخروطی تھی اور اونچی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اسکا دروازہ کہاں ہے۔ چاروں دیواروں پر بانس ہی بانس ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ میں کوئی جھری یا درز تلاش کرنے لگا کہ جس میں سے باہر کچھ دیکھ سکوں۔ مگر لگتا تھا کہ باہر سے بانس کی دیواروں لیپ کر دیا گیا ہو۔ کہیں کوئی جھری یا درز تک نہیں تھی۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیا کہ باہر کی کوئی آواز ہی

سن سکوں۔ مگر باہر موت کی خاموشی طاری تھی۔ سر میں چوٹ والی جگہ پر درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں بیٹھ کر اپنے سر کو آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

اتنا مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ بھی کوئی ریڈ انڈین قبیلے کے وحشی لوگ تھے جو مجھے اغوا کر کے لے آئے ہیں اور میں ان کی قید میں ہوں۔ تھوڑی سی امید دل میں ضرور تھی کہ جب سانگوش وہاں آیا اور مجھے نہ پایا تو وہ ضرور میرے تلاش میں نکلے گا۔ ہو سکتا ہے اسے کسی جگہ سے یہ نشانی مل جائے کہ مجھے انڈین قبیلے کے جنگلی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان قبیلے والوں کو جانتا ہو اور وہ میرے تلاش میں یہاں آئے اور مجھے ان کی قید سے چھڑا کر لے جائے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کب تک بے ہوش رہا ہوں۔ خدا جانے یہ وہی رات تھی جب ان جنگلی ریڈ انڈین نے مجھے اغوا کیا تھا یا دوسری رات آگئی تھی یا دن کا وقت تھا۔ لیکن دن کا وقت نہیں تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو کم از کم جھونپڑی کی چھت سے مجھے دن کی تھوڑی بہت روشنی ضرور نظر آتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

دل میں بار بار یہ خوف سانپ کی طرح سر اٹھاتا کہ یہ لوگ مجھے کس لئے اغوا کر کے لائے ہیں؟ کہیں یہ اپنے دیوتا کے آگے میری قربانی تو نہیں دینے والے؟ میں نے سانگوش ہی سے سن رکھا تھا اور کتابوں میں بھی پڑھا تھا کہ افریقہ اور برازیل کے جنگلوں میں ابھی ایسے وحشی قبیلے موجود ہیں جو اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسانوں کی قربانی دیتے ہیں اور یہ انسان وہ ہوتے ہیں جنہیں یہ ریڈ انڈین جنگل میں ادھر ادھر سے پکڑ کر لے آتے ہیں۔ "روسٹ بکرے" کے خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں جلدی سے اٹھ کر دیوار کے پاس آیا اور اسے زور زور سے دھکیلنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ بانس کی دیوار ہے میں اسے گرا کر بھاگ جاؤں گا مگر دیوار اتنی مضبوط تھی کہ لگتا تھا باہر سے اسکی پتھروں سے چنائی کی گئی ہو۔ میں اس کا دروازہ

تلاش کرنے لگا۔ آخر ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے سے مجھے اسکے دروازے کا سراغ مل گیا۔ میں نے اسے زور سے دھکیلا۔ یہ دروازہ بھی اتنی مضبوطی سے بند تھا کہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ میں نے زیادہ زور لگایا تو چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہی باہر سے کسی شیر کے غرانے اور پھر گرجنے کی آواز آئی۔ میں دوڑ کر پیچھے ہٹا اور بیٹھ گیا۔

میرے خدا! کیا ان لوگوں نے میرے پہرے پر کوئی شیر بٹھا رکھا ہے؟ میں مایوس ہو کر وہیں بیٹھا رہا اور خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ وہ میرے گناہ معاف کر دے اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلائے۔ سر کی چوٹ برابر درد کر رہی تھی۔ میں لیٹ گیا۔ یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ اب خدا ہی مجھے یہاں سے بچا سکتا ہے۔ اگر میری زندگی لکھی ہوئی تو بچ جاؤں گا۔ نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ نیند کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ آنکھیں درد کرنے لگی تھیں۔ کسی وقت یہ خیال ضرور آتا کہ شاید سانگوش میری تلاش میں وہاں پہنچ جائے۔ میرے پاس گھڑی بھی نہیں تھی۔ خدا جانے کتنا وقت گذر گیا ہو گا کہ مجھے ایسی آواز آئی جیسے باہر سے کوئی دروازہ کھول رہا ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میری آنکھیں دیئے کی روشنی میں بانس کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ آہستہ سے کھلا اور ایک لڑکی اندر آگئی جس نے ریڈ انڈین کا لباس پہن رکھا تھا۔ لمبا کرتہ تھا۔ سر کے بال کھلے تھے۔ وہ پاؤں سے ننگی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اپنے ہونٹوں پر اس طرح انگلی رکھی جیسے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی ہو۔ میں امید کے عالم میں آنکھیں کھولے اس کو دیکھنے لگا۔ وہ دبے پاؤں چلتی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کا

رنگ گورا تھا۔ آنکھیں سبزی مائل تھیں۔ اس نے بڑی صاف انگریزی میں دھیمی آواز میں کہا:

"میں تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گی۔ یہ بڑا مشکل کام ہے مگر میں کوشش کروں گی۔ میں تمہیں صرف یہی کہنے آئی ہوں کہ تم گھبرانا مت۔۔۔"

میں نے آہستہ سے کہا:۔"ان لوگوں نے مجھے کس لئے پکڑا ہے۔ تم کون ہو؟"

لڑکی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر دھیمی آواز میں کہا:

"یہ وقت ان سوالوں کے جواب دینے کا نہیں ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔"

"یہ لوگ میری انسانی قربانی تو نہیں کریں گے۔۔؟"

لڑکی نے کہا:۔"وہ تمہیں اسی لئے پکڑ کر لائے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔"

اس نے اپنے ہونٹوں پر اسی طرح انگلی رکھی اور کھڑی ہو گئی۔ پھر دبے پاؤں چلتی دروازے کے پاس گئی۔ تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر دیکھا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ مجھے دروازے پر باہر سے تالا لگنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی شیر کی غراہٹ سنائی دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شیر اس لڑکی کو جانتا ہے اور اس کے آنے جانے کا عادی ہے۔ میرے دل میں امید کی شمع روشن ہو گئی۔ خدا نے میرے بچاؤ کی ایک صورت پیدا کر دی تھی۔ اب آگے میری قسمت تھی کہ یہ لڑکی مجھے وہاں سے بھگانے میں کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ ریڈ انڈین لڑکی اتنی صاف انگریزی کیسے بول لیتی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ لڑکی کے نقش و نگار ایمزن کی ریڈ انڈین لڑکیوں ایسے نہیں ہیں۔ ضرور اس لڑکی کو بھی یہاں اغوا کر کے لایا گیا ہے اور قبیلے کے سردار نے یا اس کے بیٹے نے اسے اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا ہو گا۔ اس قسم کی کہانیاں بھی میں

کہانیاں بھی میں نے کافی پڑھی تھیں کہ وحشی قبیلے کے لوگ شکاریوں اور ان کی عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔

جو کچھ بھی تھا یہ لڑکی میرے لئے فرشتہ اور رحمت بن کر وہاں آگئی تھی۔ اگر وہ رات کے وقت شیر کے پہرے میں مجھ سے ملنے آگئی ہے تو وہ مجھے یہاں سے نکالنے میں بھی ضرور کامیاب ہوگی۔۔۔۔۔۔ لڑکی جلدی میں تھی۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا تھا کہ رات کا کیا بجا ہوگا اور کیا یہ دوسری رات تھی یا پہلی رات ہی تھی۔ جب لڑکی نے دروازہ تھوڑا سا کھولا تھا تو میری نگاہ باہر گئی تھی۔ باہر اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ رات کا ہی وقت تھا۔ مجھے بھوک اور پیاس محسوس ہونے لگی۔ ذرا زندگی کی امید بندھی تو بھوک اور پیاس بھی جاگ اٹھی تھی۔ یہ دوسری رات ہی تھی۔ ان لوگوں نے بے ہوشی کی حالت میں ہی میرے منہ میں کوئی ایسا مشروب ڈال دیا ہوگا جس نے سارا دن مجھے بھوک پیاس نہیں لگنے دی تھی۔

میں اسی طرح سوکھی گھاس پر لیٹا رہا۔ نیند بالکل غائب تھی۔ میں جاگتا رہا اور رات گزرتی رہی۔ پھر باہر سے پرندوں کی آوازیں آنے لگیں۔ صبح ہو رہی تھی۔ اتنے میں باہر سے شیر کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور صبح کی نیلی روشنی کے ساتھ دو ریڈ انڈین اندر داخل ہوئے۔ ان کے کاندھوں سے تیر کمان لٹکے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں رسی تھی۔ اس نے میرے پاؤں میں رسی کس کر باندھی اور مجھے آگے لگا کر جھونپڑے سے باہر لے آئے۔ باہر سب سے پہلے جس پر میری نگاہ پڑی وہ ایک بہت بڑا گھنے بالوں والا زرد رنگ کا شیر تھا اور جھونپڑی کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مگر اپنی جگہ پر ہی رہا۔ اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہ ہلا۔ صبح کی پھیکی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ارد گرد اونچے اونچے درخت ہی درخت ہیں۔ ان درختوں کے درمیان ریڈ انڈین قبیلے کے لوگوں کی مخروطی

جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ دو عورتیں ایک جھونپڑی کے باہر آگ جلا کر بیٹھی کچھ پکا رہی تھیں۔

دونوں ریڈ انڈین مجھے درختوں کے پیچھے ایک تالاب کے پاس لے گئے۔ جس جنگلی نے میری پاؤں میں بندھی ہوئی رسی پکڑی رکھی تھی وہ تالاب کی طرف اشارہ کر کے مجھے کچھ سمجھانے لگا۔ وہ بار بار اپنا ہاتھ منہ پر ملتا تھا۔ اسکا مطلب تھا کہ یہاں بیٹھ کر ہاتھ دھو لو۔ وہ مجھے وہاں بٹھا کر رسی کو کھولتا ہوا اپنے ساتھی کے ہمراہ وہاں سے دور چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مجھے نظر آنا بند ہوگیا۔ میں نے تالاب پر منہ ہاتھ دھویا۔ خدا کے حضور خضوع و خشوع سے اپنی زندگی کی دعا مانگی۔ آگے سے دولت کے لالچ اور اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی دولت کی ہوس میں کسی خزانے کی تلاش میں نہیں نکلوں گا۔ بس مجھے پر اپنے کرم سے اس بار یہاں سے نکال دے۔۔۔

میرے پاؤں میں رسی بندھی ہوئی تھی جس کا ایک سرا دور بیٹھے ریڈ انڈین کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ یقیناً مجھے جھاڑیوں میں سے دیکھ بھی رہا ہوگا۔ اس کے پاس تیر کمان بھی تھا۔ دوسرے کے پاس بھی تیر کمان تھا۔ ان کے تیر عموماً زہر میں بجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ نشانہ باندھ کر وہ تیر چلاتے ہیں۔ جس کے لگتے ہی زہر کے اثر سے آدمی وہیں بے حس ہو کر گر پڑتا ہے۔

میں منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہو کر اٹھا اور بڑے وفادار قیدی کی طرح جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ میں نے اس بات سے بھی اندازہ لگایا کہ ریڈ انڈین مجھے دیکھ رہا تھا کہ میرے چلتے ہی رسی بھی اپنے آپ کھنچی جانے لگی۔ یقیناً میں اس کی نظروں میں تھا۔ مجھے ایک بار پھر اسی جھونپڑے میں قید کر دیا گیا۔ جھونپڑے میں داخل ہوتے ہوئے میں شیر کو باہر بیٹھے دیکھا۔ اس وقت تک صبح کی سفیدی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ شیر

بڑا تنومند تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا غرایا اور اپنی بڑی بڑی انگارہ آنکھوں سے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ میں جھونپڑے میں داخل نہ ہو گیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد وہی دو ریڈ انڈین میرے لئے کیلے کے پتوں پر رکھ کر ابلی ہوئی شکر قندی، مکئی کی ایک موٹی روٹی جس پر مچھلی کا اچار پڑا تھا اور چار چھ کیلے لے آئے۔ مجھے بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ میں اس خوان نعمت پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں ریڈ انڈین میرے سامنے بیٹھے مجھے کھاتا دیکھتے رہے۔ وہ آپس میں بھی کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو ان دونوں کے گلے میں ایک ایک ہار پڑا تھا جس میں انسانی مٹھی کے برابر ایک آدمی کا سر لٹک رہا تھا۔ سر کے باقاعدہ بال تھے۔ مونچھیں بھی تھیں۔ میری روح تک خوف کے مارے کانپ اٹھی۔ یہ دونوں سر کسی گورے آدمی کے لگ رہے تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے ان دونوں کو پکڑ کر اپنی خاص تکنیک سے انہیں چھوٹا کر کے سکیڑ کر اتنا بنایا اور گلے میں ڈال لیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ میں کھانا کھا چکا تھا۔ ورنہ اس کے بعد شاید دہشت کے مارے میری بھوک بھی مٹ جاتی۔ جب میں کھانا کھا چکا اور پانی بھی پی چکا تو وہ دونوں خالی پتے اٹھا کر دروازہ باہر سے مقفل کر کے چلے گئے۔ تب مجھے سانگوش کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ ایمزن اور افریقہ کے بعض قبیلے ایسے ہیں جنہیں انسانی سر کو سکیڑ کر نارنگی جتنا بنانے کا فن آتا ہے۔ عام طور پر وہ اپنے دشمنوں کے سر چھوٹا کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ملک کا آدمی ان کے ہاتھ آ جائے تو سر بھی سکیڑ کر چھوٹا کر کے گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔

تو کیا وہ میرے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے والے تھے؟

کیا وہ میرا سر بھی کاٹ کر چھوٹا کرنے والے تھے؟ لیکن شاید میرے ساتھ وہ ایسا نہ کر سکیں.... کیونکہ لڑکی نے بتایا تھا کہ مجھے اپنے دیوتا پر قربان کرنے کی تیاریاں کر رہے

ہیں۔ شاید اسی لئے وہ مجھے اچھی سے اچھی خوراک کھلا رہے تھے۔ اگر سر کاٹ کر چھوٹا کرنا ہوتا تو مجھے اعلیٰ غذا کھلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مجھے اغوا کرنے کے فوراً بعد میرا سر کاٹ کر رکھ لیتے۔ میں سخت مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میرے لئے واقعی زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ اگر کوئی بچنے کی ذرا سی امید تھی تو وہ گوری لڑکی تھی جس نے رات کو آ کر مجھے کہا تھا کہ تمہیں یہاں سے بھگا دوں گی فکر نہ کرو۔ لیکن وہ ایک کمزور عورت تھی۔ خدا جانے وہ ایسا کر بھی سکے گی یا نہیں۔ اگر حالات نے ساتھ نہ دیا اور کوئی موقع نہ پیدا ہو سکا تو وہ بے چاری بھی کچھ نہ کر سکے گی اور مجھے کسی اندھے بے جان لکڑی یا پتھر کے بت کے آگے ڈال کر ہلاک کر دیا جائے گا۔

میں نے ان لوگوں کی انسانی قربانی کے بارے میں بڑی کہانیاں پڑھی تھیں۔ ایک کہانی میں لکھا تھا کہ جس آدمی یا عورت کو دیوتا کے آگے قربان کرنا ہوتا ہے، اس کو پہلے یہ خوب کھلاتے پلاتے ہیں، پھر قربانی والی رات کو مشعلوں کی روشنی میں یہ اس بدقسمت انسان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر لاتے ہیں۔ دیوتا کے بت کے آگے پتھر کی سل پر سیدھا لٹا کر اس کے چاروں ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے جکڑ دیتے ہیں۔ پھر ایک آدمی چھرا لے کر آتا ہے اور اس بدنصیب کا سب سے پہلے پیٹ چاک کر کے ہاتھ ڈال کر اس کا دل کھینچ کر نکال لیتا ہے اور نعروں کی گونج میں وہ دل دیوتا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد جکڑے ہوئے آدمی کی کھوپڑی توڑ کر اس کا مغز نکالا جاتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک کہانی میں یہ بھی لکھا تھا کہ قربان کئے جانے والے آدمی کے جسم کے ٹکڑوں کو یہ آدم خور ریڈ انڈین بھون کر کھا جاتے ہیں۔ کاش میں نے رسالوں میں یہ کہانیاں نہ پڑھی ہوتیں۔ میرا خوف کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ مگر سوائے خوف زدہ ہونے کے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کو پھر وہی ریڈ انڈین میرے لئے کھانا لے کر آ گئے۔ اس بار کھانے میں بطخ کا بھنا ہوا گوشت اور مکئی کی روٹی تھی۔ ساتھ پھل اور دودھ بھی تھا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا مگر خدا جانے یہ وہاں کے پانی کا اثر تھا کہ مجھے بڑی بھوک لگ گئی تھی۔ ناشتے کے وقت جو کچھ کھایا پیا تھا' وہ ہضم ہو گیا تھا۔ رات کو بھی مجھے بڑی مرغن غذا دی گئی۔ اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے قربانی کا بکرا سمجھ کر کھلا پلا کر قربانی دینے کے لئے تیار کر رہے تھے۔

اس طرح اس جھونپڑے میں چار دن اور چار راتیں گذر گئیں۔ اس لڑکی نے دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ اور مجھے یہ خوف لگا تھا کہ اب مجھے کسی بھی وقت قربانی کے لئے پکڑ کر لے جایا جائے گا۔ مجھے وہاں ریڈ انڈین کی قید میں پانچواں دن جا رہا تھا۔ اس رات آسمان پر باہر سے مجھے بادلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بارش ہوتی رہی۔ پھر رک گئی۔ رات کے وقت میری جھونپڑی میں دیا روشن کر دیا گیا تھا۔ اس رات بارش کے بعد مجھے باہر ریڈ انڈین کے گانے اور ڈھول کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ لمبی لمبی آواز نکال کر بانسریوں اور ڈھول کی تھاپ پر ضرور ڈانس کر رہے تھے۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ سمجھ گیا یہ میری قربانی کی کوئی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ شاید وہ بارش کا انتظار کر رہے تھے۔ اب صبح صبح مجھے قربانی دینے کے لئے لے جایا جائے گا۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایڈونچر کا مجھے ضرور شوق تھا مگر یہ ایڈونچر تو مجھے موت کے منہ میں لے آیا تھا۔

کچھ دیر تک ریڈ انڈینوں کے گانے کی آوازیں آتی رہیں' پھر یہ آوازیں خاموش ہو گئیں۔ میں اس انتظار میں کانپ رہا تھا کہ ابھی وہی دونوں ریڈ انڈین آئیں گے اور مجھے قربانی کے لئے نکال کر لے جائیں گے۔ کتنی ہی دیر گذر گئی۔ کوئی مجھے لینے نہ آیا۔

میں سمجھ گیا کہ قربانی صبح دی جائے گی جب سورج کے نکلنے کا وقت ہو گا۔ باہر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ کسی وقت کسی درخت پر سے بارش کا رکا ہوا پانی قطرے بن کر گرتا تو خاموشی کے ساکت سمندر میں لہریں پیدا ہو جاتیں۔ اس کے بعد پھر گہرا سکوت چھا جاتا۔ میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ خوف کے مارے نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ مجھے شیر کی ہلکی سی غراہٹ کی آواز آئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مجھے لے جانے والے ریڈ انڈین آ گئے تھے۔ میرا جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ حلق خشک ہو گیا۔ دروازے پر لگے تالے کے کھلنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ جلدی سے وہی لڑکی اندر آئی اور اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اپنے سر پر ایک رومال باندھ رکھا تھا۔ میری طرف دیکھ کر انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ تھوڑا تھوڑا دروازہ کھول کر باہر دیکھ رہی تھی۔ مجھے باہر سے ہڈیاں چبانے کی آواز آئی۔

ایک بار پھر اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو مجھے آہستہ سے انگریزی میں کہا:۔"آجاؤ۔"

میرے تن مردہ میں گویا جان پڑ گئی۔ فرار کا وقت آ گیا تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ لڑکی تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ باہر اندھیرا تھا مگر اس اندھیرے میں مجھے شیر نظر آ گیا جو دوسری طرف منہ کئے گوشت کے بڑے لوتھڑے کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولی:

"میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔ شیر کی طرف مت دیکھنا۔"

میں دبے پاؤں اس کے پیچھے چلا۔ مگر شیر کو دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ شیر کا منہ دوسری طرف تھا۔ وہ گوشت اور ہڈیاں چبانے میں مشغول تھا۔ یہ لڑکی شیر کو مجھ سے غافل کرنے کے لئے اپنے ساتھ گوشت کا بڑا سا ٹکڑا خدا جانے کہاں سے لے آئی تھی۔ یہ

لوتھڑا اس نے شیر کی پشت کی جانب پھینک دیا تھا تاکہ شیر کا منہ جھونپڑی کی طرف سے پھر جائے۔ گھاس والی زمین گیلی تھی۔ وہ جھونپڑی سے نکلنے کے بعد درختوں کی طرف تیز تیز چلنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تیز تیز چلنے لگا۔ درختوں میں پہنچنے کے بعد وہ رک گئی۔ پھر ایکدم بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے بھی بٹھالیا۔ شاید اس نے کسی آہٹ کو سنا تھا۔ مجھے اپنے سانس کی اور لڑکی کے سانس کے چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایک دو سیکنڈ کے بعد اس نے میرے کان میں سرگوشی کی:

"جس طرف میں بھاگوں تم اسی طرف میرے پیچھے بھاگتے چلے آنا۔"

وہ اٹھی اور درختوں کے نیچے اونچی اونچی جھاڑیوں میں بھاگنے لگی۔ میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ جھاڑیوں میں ایک تنگ سا رستہ بنا ہوا تھا۔ ہم دونوں بھاگتے چلے جارہے تھے۔ آگے ڈھلان آئی۔ ہم ڈھلان پر بھی بھاگتے رہے۔ اس کے بعد چڑھائی آگئی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ چڑھائی ختم ہوئی تو آگے پھر ڈھلان شروع ہوگئی۔ پھر ہموار زمین آگئی۔ یہاں بڑے گھنے درخت تھے جن کی ٹہنیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ وہ مجھے بڑے خاص راستے سے لے جارہی تھی جہاں جھاڑیوں میں ایک پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ لگتا تھا اسے جنگل کے سارے رستوں کا علم تھا۔

اندھیرے میں مجھے دھندلی دھندلی ساری جھاڑیاں درخت آنے لگے تھے۔ ہمارے سروں پر درختوں کی گھنی شاخیں تھیں۔ ان درختوں سے باہر آئے تو سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ ہم رک گئے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا:

"اب کیا کریں؟ مجھے تھوڑا تھوڑا تیرنا آتا ہے۔"

لڑکی نے انگریزی میں کہا:

"فکر نہ کرو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مجھے دریا کے کنارے ایک جگہ جھاڑیوں کے پاس لے گئی۔ ان جھاڑیوں میں ایک بہت بڑے بوٹ جتنی ایک کشتی چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ ہم نے کھینچ کر کشتی باہر نکالی۔ کشتی میں دو چپو بھی تھے۔

"جلدی سے بیٹھ جاؤ۔"

کشتی کو ہم نے دریا کی لہروں پر ڈالا اور جلدی سے اس میں بیٹھ گئے اور کشتی دریا کے بہاؤ کے ساتھ تیزی سے آگے بہنے لگی۔

"چپو بھی چلاؤ۔ ہمیں جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جانا ہے۔"

میں نے چپو چلانے شروع کر دیئے۔ مجھے کشتی رانی کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر مصیبت کے وقت آدمی کو ہر کام آجاتا ہے۔ میں بڑی مہارت سے چپو چلا رہا تھا۔ میں نے انگریزی فلموں میں لوگوں کو اسی طرح چپو چلاتے دیکھا تھا۔ کشتی کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔ اس وقت اندھیرے میں آسمان پر بجلی چمکی۔ بادلوں میں گرج سنائی دی اور بارش شروع ہوگئی۔ موسم چونکہ گرم تھا' اس لئے بارش اس موسم میں مجھے اچھی لگی۔ کشتی کو ہم ساحل کے ساتھ ساتھ بہاؤ کے رخ پر چلا رہے تھے۔ رات گھپ اندھیری تھی۔ کھلی جگہ پر ہونے کی وجہ سے ہمیں دریا کا پاٹ اور کنارے کے درختوں کے سیاہ خاکے دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکی کشتی کے دوسرے سرے پر سامنے کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی۔ وہ ان راستوں سے واقف تھی۔ بارش زیادہ تیز نہیں تھی۔ بس ہلکی ہلکی ہو رہی تھی۔ دریا کے بہاؤ میں کوئی ہیجان یا طوفان نہیں تھا۔ یہ بھی دریائے ایمزن کی ایک شاخ تھی۔ لڑکی نے میری طرف منہ کر کے کہا:

"کشتی کو کنارے کے ساتھ ساتھ رکھو۔ دریا کے درمیان میں لے گئے تو آگے اٹلانٹک کا سمندر ہے۔"

رات کے اندھیرے اور بارش میں سمندر کا نام سن کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے بائیں طرف والے چپو پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ اس عمل سے کشتی کنارے کے مزید قریب ہوگئی۔ مجھے کشتی چلانے کی عادت نہیں تھی۔ میں تھک گیا۔ میرے ہاتھوں کو سست پڑتے محسوس کرتے ہوئے لڑکی کھسکتی ہوئی میرے قریب آگئی۔

"چھوڑ دو۔ اب میں چلاتی ہوں۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا۔ میری ہتھیلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر چپو مجھ سے لے لئے اور میں کشتی کے دوسرے سرے پر جاکر بیٹھ گیا۔ رات کی گہری خاموشی میں بارش کی معمولی سی آواز تھی یا چپو کے پانی میں چلنے کی آواز تھی۔ اس کے علاوہ ہر طرف ایک ڈراؤنا سکوت تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا:

"تم نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔ میرا نام۔۔۔"

میں نے اپنا نام بتاتے ہوئے پوچھا تو وہ چپو چلاتے ہوئے بولی:

میرا نام فلورا ہے۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ میں تمہیں اپنے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔"

میں نے کہا:۔"اوکے۔۔۔ لیکن ہم دریا میں آگے کہاں جا رہے ہیں؟"

فلورا نے دو تین سیکنڈ کی خاموشی کے بعد جواب دیا:

"ابھی خاموش رہو۔ مجھے آرام سے کشتی چلانے دو۔"

میں نے اس کے بعد اس سے کوئی بات نہ کی۔ کشتی ساحل سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر آگے بہتی چلی جا رہی تھی۔ میں دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے ایک ہولناک موت سے معجزانہ طور پر بچا لیا۔ اگرچہ ہم ابھی تک خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے تھے مگر پھر بھی وہ انڈین آدم خوروں کے علاقے سے کافی دور جا چکے

تھے۔ اسی طرح کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ اس دوران دس پندرہ منٹ لڑکی فلورا کشتی چلاتی' دس پندرہ منٹ میں کشتی چلاتا رہا۔ اندھیرے میں مجھے لگا کہ دریا کا پاٹ ایک سمت کو بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے فلورا سے کہا:

"کہیں ہم سمندر میں تو نہیں آگئے؟"

وہ کشتی کے دوسرے سرے پر بیٹھی پانی میں ہاتھ ڈال کر کچھ محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک دو بار اس نے پانی چلو میں بھر کر منہ میں ڈال کر تھوک بھی دیا تھا۔ کہنے لگی:

"ہم دریائے ایمزن کے ڈیلٹے میں داخل ہو چکے ہیں۔ دریا میں سمندر کا پانی داخل ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا:۔"کہیں دریا کی لہریں ہمیں بہا کر سمندر کی طرف نہ لے جائیں۔"

فلورا نے کہا:۔"ابھی اس کا خطرہ نہیں ہے۔ ڈیلٹے کے علاقے میں چونکہ ایک طرف سے سمندر کے پانی کا دباؤ ہوتا ہے اور دوسری طرف سے دریا کے پانی کا دباؤ ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں پانی میں زیادہ ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ دریا کا بہاؤ سست ہو گیا تھا اور چپو چلاتے ہوئے زیادہ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ فلورا کہہ رہی تھی:

"لیکن اب ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ تھوڑی دور ہی آگے جانا ہو گا۔ تم کشتی کو مزید کنارے کی طرف لے آؤ۔"

وہاں دریائی سرکنڈے جگہ جگہ اگے ہوئے تھے۔ ہم کشتی کو ان کے درمیان سے گذار کر آگے بڑھ رہے تھے۔ دریا کا کنارا میری بائیں جانب مزید دور ہو گیا تھا۔ میں کوشش کر کے کشتی کو ساحل کی طرف لانے لگا۔ اب فلورا نے چپو سنبھال لئے۔ رات کی تاریکی میں ساحل کے درختوں کے سیاہ جھنڈ قریب آ رہے تھے۔ ایک جگہ ساحل کا

کونا دریا میں آگے تک چلا گیا تھا۔ یہاں ایک چٹان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ فلورا کشتی کو اس چٹان کے پاس لے جا رہی تھی۔ میں نے دوسرا چپو اس سے لے لیا اور زور لگا کر کشتی کو چٹان کی طرف لے آئے۔ یہاں زمین دلدلی تھی۔ دلدل سے مجھے بڑا خوف آتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہاں دلدل محسوس ہوتی ہے۔ وہ بولی:۔ "یہ دلدل نہیں ہے۔ دلدل آگے چٹان کی دوسری طرف سے شروع ہوتی ہے۔۔۔"

وہ کشتی سے اتر پڑی۔ اسے دیکھ کر میں بھی کشتی سے اتر آیا۔ یہ دلدل نہیں کیچڑ تھا۔ میں نے کہا:

"ہمیں کشتی کو کسی جگہ ضرور چھپا دینا چاہیے۔"

وہ کہنے لگی:

"اسکی ضرورت نہیں ہے۔ اسے یہیں چھوڑ دو' آؤ میرے ساتھ"

کشتی کو ہم نے وہیں کیچڑ اور پانی میں چھوڑا اور ساحلی علاقوں کی طرف چل پڑے۔ فلورا میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ جھاڑیاں اور سرکنڈے ہمارا راستہ روک رہے تھے۔ وہ ایک جگہ رک کر کہنے لگی:

"ہم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں لیکن رات کے وقت اس جنگل میں سفر کرنا خطرناک ہو گا۔"

میں نے کہا:۔ "ہم یہیں کہیں رات گذارنے کا کوئی بندوبست کرتے ہیں۔۔۔"

وہ اس جانب دیکھ رہی تھی جہاں درخت دریا کی طرف تکون کی شکل میں تھے۔ وہاں وہی چٹان آگے کو جھکی ہوئی تھی جو مجھے دریا میں بھی نظر آئی تھی۔ اس نے کہا:

"آؤ۔ اس چٹان میں کوئی ٹھکانہ ڈھونڈتے ہیں۔"

چٹان بالکل سیدھی نہیں تھی۔ آگے سے وہ جھکی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے اندر کی طرف اندھیرے میں ایک شگاف نظر آ رہا تھا۔ ہم اس شگاف میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں

ہم بارش سے بھی بچ گئے تھے۔ فلورا نے سر پر بندھا ہوا رومال کھول کر نچوڑا اور اسے دوبارہ سر پر باندھتے ہوئے بولی:

"یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں ہے مگر یہ ریڈ انڈین قبائل سے محفوظ ہے۔ میں نے اسی لئے جنگل کا راستہ چھوڑ کر دریائی راستے کا انتخاب کیا تھا اور ایک کشتی دو راتیں پہلے وہاں چھپا کر رکھ دی تھی۔"

میں اسکا شکریہ ادا کرنے لگا کہ اسکی وجہ سے میری جان بچ گئی ورنہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ وہ بولی:

"انہوں نے اب جس روز بھی سورج بادلوں میں سے نکلتا' تمہیں سورج دیوتا پر قربان کر دینا تھا۔ ان کی سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔"

میں نے کہا:۔ "وہ ضرور ہماری تلاش میں ہوں گے۔ کہیں وہ اس جنگل میں تو نہیں آ جائیں گے؟"

فلورا کا چہرہ رات کے اندھیرے میں مجھے دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وہ شگاف میں چٹان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے گھٹنوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ شاید وہ خنکی محسوس کر رہی تھی کیونکہ وہاں سردی اگرچہ نہیں تھی لیکن ٹھنڈک ضرور تھی۔ کہنے لگی:

"اس طرف وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ کیونکہ اس طرف جو جنگل شروع ہوتا ہے' وہاں کسی دوسرے ریڈ انڈین قبیلے کی حکمرانی ہے اور یہ لوگ ایک دوسرے کے علاقے میں داخل نہیں ہوتے' تم بے فکر رہو۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر بھی ابھی تک خطرہ میرے سر پر ضرور منڈلا رہا تھا۔ کم از کم مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر کہنے لگی:

"یہاں سے آگے ہم برازیل کے کسی شہر میں نہیں داخل ہوں گے۔ ہم اس وقت برازیل کی شمال مشرقی سرحد پر ہیں' آگے جنگل ہے' اس جنگل کے آگے فرنچ گی آنا کے ملک کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ ملک فرانس کے قبضہ میں ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہم ہر طرح سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پھر ہمیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ البتہ فرنچ گیانا کی سرحدی پولیس نے اگر ہمیں پکڑ لیا تو ان کے ساتھ بک بک جھک جھک ضرور ہو گی کیونکہ ہم پاسپورٹ ویزے کے بغیر ان کے ملک میں داخل ہو رہے ہوں گے۔ کیا تمہارے پاس پاسپورٹ ہے؟"

میں نے کہا:۔ "نہیں میرا پاسپورٹ اس خیمے کے اندر ہی رہ گیا ہے جو میرے دوست نے وہاں لگایا تھا؟"

"کون تھا تمہارا دوست اور تم اس طرف کیا لینے آ گئے تھے؟"

فلورا کے اس سوال پر میں حقیقت کو گول کر دیا۔ اسے بالکل نہ بتایا کہ میں اپنے دوست سانگوش کے ساتھ مدفون خزانے کی تلاش میں وہاں آیا تھا۔ میں نے اس کے آگے جھوٹ بولتے ہوئے کہا:

"ہم یونہی جنگل میں شکار وغیرہ کی تلاش اور سیر و سیاحت کے واسطے برازیلیہ سے آ گئے تھے۔ میرے دوست کو شکار کا بڑا شوق ہے۔ میں واشنگٹن سے اس سے ملنے برازیلیہ آیا ہوا تھا۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ شکار پر لے آیا۔ رات کو اس نے جنگل میں کسی شیر وغیرہ کی آواز سنی تو بندوق اٹھا کر بولا۔۔ تم خیمے میں ہی ٹھہرو میں شیر کا سراغ لگا کر آتا ہوں۔ وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ریڈ انڈین لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اور مجھے بے ہوش کر کے اپنے قبیلے میں لے آئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' تم جانتی ہی ہو۔۔۔"

فلورا کی آنکھیں اندھیرے میں کسی وقت ہلکی سی چمک دے جاتی تھیں۔ وہ بڑے غور سے میری جھوٹی کہانی سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا:

"تم امریکی نہیں ہو۔ کیا تم انڈین باشندے ہو۔ میرا مطلب ہے انڈیا جہاں سانپ اور سادھو رہتے ہیں۔"

میں نے کہا:۔ "نہیں۔ میں پاکستان کے ملک کا رہنے والا ہوں۔ واشنگٹن اپنے دوست کے ہاں چند روز گذارنے آ گیا تھا۔ وہاں سے میرے برازیل کے دوست نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ اور میں برازیل چلا آیا۔

فلورا خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھے پاکستان کا ملک بڑا پسند ہے۔ پاکستان کا لوگ بہت بہادر ہے۔ سن ۱۹۶۵ میں انہوں نے انڈیا کی بہت بڑی فوج کا حملہ اپنی مختصر سی فوج سے روک لیا تھا بلکہ کئی جگہوں پر پاکستانی فوج انڈیا کے علاقے میں ایڈوانس بھی کر گئی تھی۔"

میں نے اپنے پاکستانی ہونے پر بہت فخر محسوس کیا اور کہا۔

"انڈیا نے ابھی تک پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ پاکستان کے وجود کو ختم کر دیا جائے۔ سن ۶۵ء میں اس نے اسی مذموم مقصد کی خاطر پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ اپنے ناپاک عزائم میں بری طرح ناکام ہوا۔ عالمی پریس گواہ ہے کہ ہماری پلاٹونوں اور کمپنیوں کی مختصر نفری نے انڈیا کے بریگیڈوں اور ڈویژنوں کا اس جانبازی سے مقابلہ کیا کہ ہر محاذ پر انہیں پسپا بھی کیا اور بھسم بھی کیا۔"

فلورا نے کہا۔

"میں بی بی سی اور امریکہ ریڈیو اور ٹی وی پر تمہاری جنگ کی خبریں سنتی رہی ہوں۔ واقعی تم لوگوں نے بہادری اور جانبازی کی نئی مثال قائم کی ہے۔"

یکدم وہ اچانک موضوع کو بدلتے ہوئے بولی۔

"تم پاکستان میں کیا کرتے ہو؟ کیا تم شادی شدہ ہو؟"

چونکہ جھوٹ بولنے کی کافی عادت مجھے پڑی ہوئی تھی' اس لئے میں نے یہاں بھی اس کے آگے جھوٹ بولا۔

"میں پاکستان کے شہر لاہور میں اخبار نویسی کرتا ہوں اور میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ مگر ابھی تک تم نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ تم ان لوگوں میں کیسے پھنس گئیں؟ تم مجھے کسی لحاظ سے بھی ریڈ انڈین نہیں لگتیں؟"

فلورا نے گہری آواز میں کہا۔

"میں میامی فلوریڈا کی رہنے والی ہوں۔ میں میامی کے ایک کمرشل سٹور میں جاب کرتی تھی۔ وہاں میرا ایک بوائے فرینڈ بن گیا۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے جیسا کہ ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے۔ میں گاؤں سے آئی تھی۔ گاؤں میں میرے ماں باپ اب بھی کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ میں اپنا مستقبل خود بنانے میامی چلی آئی تھی۔ میرے بوائے فرینڈ کا نام جونی تھا۔ وہ میامی کے ایک ڈاؤن ٹاؤن کے ایک فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ میں اس کے پاس چلی آئی۔ ہم دونوں بغیر شادی کے میاں بیوی کی طرح رہنے لگے جیسا کہ ہمارے امریکی معاشرے میں ہوتا ہے۔ جونی بڑا اچھا لڑکا تھا۔ مگر اس میں ایک خرابی تھی۔ وہ راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ ریس بھی کھیلتا تھا۔ پھر اس کو کہیں سے پتہ چلا کہ برازیل کے شمالی جنگلوں میں تین پہاڑیاں ہیں جن کے اندر سرنگوں میں ریڈ انڈین سرداروں کے قیمتی خزانے دفن ہیں اور برازیل کی حکومت نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ لوگ چاہیں تو وہاں سے جو نکلتا ہے نکال سکتے ہیں۔ مگر یہ اجازت برازیل کے رہنے والوں کے لئے تھی۔ جونی اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہو گیا' میں نے اسے منع بھی کیا کہ اگر ہمیں تھوڑا بہت خزانہ مل بھی گیا تو وہاں سے امریکہ نہیں لا سکیں گے۔ وہ کہنے لگا' میں کسٹم والوں

کو رشوت دے کر راضی کر لوں گا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگنے والا ہے ہم کروڑ پتی بننے والے ہیں۔ پھر ہم اپنا گارڈن ہاؤس خرید لیں گے۔ ہمارے پاس مرسیڈیز کار ہو گی ہم عیش کریں گے۔"

میں سوچنے لگا کہ اس امریکی لڑکے پر بھی میری طرح دولت کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ فلورا خاموش ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

وہ بولی "بس ایک روز ہم خزانے کی تلاش میں میامی سے پرواز کر کے برازیلیا پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم جنگلوں میں خچروں پر سفر کرتے آخر ان تین پہاڑیوں کے پاس پہنچ گئے جس کی سرنگوں میں جونی کے خیال کے مطابق ریڈ انڈین سرداروں کے خزانے دفن تھے۔ اس نے باقاعدہ نقشہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ ہم پہلی پہاڑی کی سرنگ کا سراغ لگا کر اس کے اندر گئے تو معلوم ہوا کہ اندر جتنی قبریں تھیں ساری کی ساری کھدی ہوئی ہیں اور ہم سے پہلے جو لوگ یہاں پہنچے تھے وہ خزانہ نکال کر لے جا چکے ہیں۔ ہم دوسری اور پھر تیسری سرنگ میں گئے۔ وہاں بھی قبریں ادھڑی ہوئی تھیں اور گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں سونے کی ایک تار بھی نہ ملی۔ جونی کہنے لگا۔ فلورا' ہم شاید غلط پہاڑیوں میں آ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے جنگل میں آگے کوئی اور بھی تین اکٹھی پہاڑیاں ہیں۔ ہم کل اس کی تلاش میں نکلیں گے۔ خزانہ ضرور ان پہاڑیوں میں مدفون ہو گا۔ ہم نے پہاڑی کے پاس ہی درختوں میں چھوٹا سا سفری خیمہ لگا رکھا تھا۔ ہم وہاں آ کر لیٹ گئے۔ جونی کہنے لگا' میرا کافی پینے کو جی چاہتا ہے۔ باہر آلاؤ کی آگ پوری طرح نہیں بجھی تھی۔ وہ کیتلی میں کافی اور پانی ڈال کر باہر چلا گیا۔ اچانک مجھے اس کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں دوڑ کر باہر گئی۔ باہر ہم نے گیس کا چھوٹا سا لیمپ جلا رکھا تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ جونی گھاس پر اوندھے منہ پڑا ہے اور اس کے حلق سے

خرخر کی آواز نکل رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ میں وہاں اکیلی تھی۔ ہماری بدقسمتی کہ ہم نے برازیلیا سے چلتے وقت سانپوں کے کاٹے کے نہ تو انجکشن لگوائے تھے اور نہ ان کے زہر سے بچنے کے لئے کوئی دوائی لی تھی۔ میں جونی کو سنبھالتی رہ گئی اور اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ میں رونے لگ گئی۔ سوائے رونے کے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ برازیل کے جنگل سینکڑوں میل تک غیر آباد اور سنسان ہوتے ہیں۔ صرف ریڈ انڈین قبائل ہی کہیں کہیں جھونپڑے ڈال کر رہتے ہیں۔ ساری رات میں جونی کی لاش کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتی رہی۔ صبح ہوئی تو میں نے چھوٹے بیلچے سے وہیں ایک گڑھا کھود کر جونی کے بے جان جسم کو اس میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی اور اس کی قبر بنادی۔ قبر کے اوپر میں نے بانس توڑ کر اس کا صلیب کا نشان لگادیا۔ ہم دونوں ایک ہی خچر پر وہاں پہنچے تھے۔ میں نے سامان سمیٹ کر خچر پر ڈالا۔ خود بھی اس پر بیٹھی اور واپس شہر کی طرف چل پڑی۔ میں اندازے سے وہ راستہ تلاش کر کے واپس جارہی تھی جس راستے سے ہم وہاں آئے تھے۔ لیکن میں راستے سے بھٹک گئی۔ ایمزن کے جنگلوں میں تجربہ کار شکاری راستہ بھول جاتے ہیں اور میں تو وہاں پہلی بار آئی تھی۔ میں غلطی سے بڑے خونخوار اور وحشی ریڈ انڈین کے علاقے میں نکل آئی تھی۔ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جنگل زیادہ گھنا ہوتا جارہا تھا۔ ایک جگہ مجھے ایک بانس زمین میں گڑا ہوا نظر آیا جس کے اوپر انسانی کھوپڑی ٹکی ہوئی تھی۔ میں ڈر گئی۔ وہیں سے پیچھے مڑی کہ ایک بار پھر صحیح راستے کا حساب لگاتی ہوں۔ میں نے خچر کو پیچھے گھمایا ہی تھا کہ مجھے ریڈ انڈین لوگوں کی خاص چیخیں سنائی دیں۔ میں خچر سے چھلانگ لگا کر درختوں کی طرف دوڑی، مگر سامنے ریڈ انڈین کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے دبوچ لیا اور اپنے ڈیرے پر لے آئے۔ یہ وہی ڈیرا تھا جہاں تم ایک جھونپڑے میں قید تھے۔ مجھے سردار کے سامنے

پیش کیا گیا۔ سردار نے مجھے اپنی بیوی بنا کر رکھ لیا۔ میں نے اسی روز سے فرار ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مگر میری زبردست نگرانی ہوتی تھی۔ ایک آدمی ہر وقت میرے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ اسی طرح ایک سال اور پھر دوسرا سال بھی گذر گیا۔ پہلے انہوں نے مجھے اس جھونپڑے میں رکھا تھا جس کے باہر سردار کا پالتو شیر پہرہ دیتا تھا اور جہاں تمہیں بھی قید کیا گیا تھا۔ پھر سردار مجھے اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔ آہستہ آہستہ میری نگرانی کم ہوگئی۔ لیکن ایک جاسوس مجھے اپنی نظروں میں رکھتا تھا۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ رہا ہوتا تھا۔ اس دوران میرے سامنے انہوں نے تین بدنصیب گورے آدمیو کو دیوتا سورج کے آگے قربان کیا۔ یہ آدمی انہیں جنگل میں چلتے پھرتے یا شکار کھیلتے مل گئے تھے اور وہ انہیں پکڑ کر لئے آئے تھے۔ میں نے ان کی جانیں بچانے کی کوشش بھی کی مگر مجھے موقع نہ مل سکا۔ میں چاہتی تھی کہ ان کے ساتھ میں بھی فرار ہو جاؤں مگر ایسا نہ ہو سکا اور دونوں آدمی دیوتا سورج پر قربان ہو گئے۔ وقت گزرتا رہا۔ میں بھی فرار ہونے کے لئے نئے نئے منصوبے تیار کرتی رہی مگر میرا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ ایک رات تمہیں پکڑ کر لے آئے۔ مجھے جب پتہ چلا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرا ایک ساتھی مل گیا ہے۔ کچھ قسمت بھی مجھ پر قربان تھی۔ ایک رات بارش میں مجھے تمہارے پاس آنے کا موقع مل گیا۔ اتنا وقت گزر جانے پر ان لوگوں نے میری نگرانی نرم کر دی تھی۔ اور رات کے وقت میری نگرانی اور پہرہ ترک کر دیا گیا تھا۔ تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی کیونکہ تم تو جوان تھے۔ تمہارے جسم میں جوانی کی طاقت تھی اور تم میرا ساتھ دے سکتے تھے۔ قبیلے کے ریڈ ایڈین تمہاری قربانی کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں یہاں سے لے کر بھاگ جاؤں گی تمہارے جھونپڑے کے باہر جو شیر پہرہ دیتا تھا وہ مجھ سے کافی مل گیا ہوا تھا اور مجھے دیکھ کر پیار سے غراتا تھا۔ جس رات بارش ہو رہی تھی تو قبیلے

کے لوگ قربانی سے پہلے ایک رسم ادا کرتے تھے۔ وہ سارے جھونپڑیوں کے پہلے اپنے دیوتا میدان میں جمع ہو کر دیوتا کی تعریف کے گیت گا رہے تھے اور ڈانس کر رہے تھے کہ میں نے اپنے محل نما جھونپڑے سے باہر نکل آئی۔ سردار تقریب میں صدر بنا بیٹھا تھا ورنہ میرا وہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔ میں اندھیرے میں چلتی تمہارے جھونپڑے میں آگئی۔ جس آدمی کو قربان کرنا ہوتا تھا اس کے جھونپڑے کی چابی سردار ہمیشہ اپنے سرہانے کے نیچے رکھتا تھا۔ میں چونکہ سردار کے جھونپڑے میں سوتی تھی اس لئے میرے واسطے یہ چابی حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پھر شیر کے بارے میں مجھے شک تھا کہ کہیں رات کو میرے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ شور نہ کر دے۔ اس لئے میں نے دوپہر ہی کو بکرے کی ایک لات کچن میں سے چرا کر اپنے بیگ کے نیچے چھپالی تھی۔ جب ایکشن کا وقت آیا تو میں نے بکرے کی لات بھی ساتھ رکھ لی تھی۔ یہ گوشت میں نے شیر کے آگے اس طرح ڈال دیا کہ جب وہ کھانا شروع کرے تو اس کا منہ دوسری طرف ہو۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تم بھی اس کے گواہ ہو۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ میں سوچنے لگا کہ اللہ نے واقعی اس عورت کو میرے لئے فرشتہ رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ اس لڑکی فلورا نے میرے آگے سچ بولا تھا کہ وہ ریڈ انڈین سردار کے مدفون خزانے کی تلاش میں وہاں آئی تھی جبکہ میں نے اس کے سامنے جھوٹ بولا تھا کہ میں اپنے دوست کے ساتھ برازیل کے جنگلوں میں شکار کھیلنے آیا تھا کہ پکڑا گیا۔ یہ اپنے اپنے ذہن کی تربیت کا معاملہ تھا۔ اس لئے میں بھی مجبور تھا اور شاید وہ بھی مجبور تھی۔

ہم دونوں چٹان کے شگاف میں دبک کر بیٹھے تھے۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ اگر بارش تیز ہو جاتی تو ہمارے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔ فلورا نے مجھے بتایا تھا کہ برازیل کے جنگلوں کی بارشیں قیامت خیز ہوتی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"نہ میرے پاس کوئی پیسہ ہے نہ تمہارے پاس کچھ ہے۔ ہم امریکہ کیسے پہنچیں گے کیونکہ تمہیں میامی چھوڑ کر مجھے آگے واشنگٹن جانا ہوگا۔"

فلورا نے کہا۔

"فرنچ گیانا پہنچ کر ہم کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے امریکہ تک کا ہوائی جہاز کا کرایہ جمع کر لیں گے۔ یہی ہو سکتا ہے۔"

مجھے اسکا خیال پسند آیا کیونکہ میں نے یہ دیکھا تھا کہ ان ممالک میں نوکری بڑی جلدی مل جاتی تھی۔ نوکری سے مراد کوئی سرکاری نوکری نہیں' بلکہ چھوٹا موٹا کام ہوتا ہے جو کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے۔ چاہے مہینے دو مہینے کے لئے ہی سہی۔ فلورا نے ٹانگیں پھیلا دیں اور بازو کے اوپر سر رکھ کر بولی۔ "میں تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔ تم بھی سو جاؤ۔ ہمیں ایک دو گھنٹے کے لئے ضرور سو جانا چاہیے۔"

امریکہ میں مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ یہاں کے لوگ بس میں' ٹیوب میں' ریل کار میں' آفس کے لنچ بریک میں' جہاں چاہیں جس وقت چاہیں' آنکھ بند کر کے کچھ دیر کے لئے سو جاتے تھے۔ فلورا بھی آنکھیں بند کرتے ہی سو گئی۔ مجھے اس کے ہلکے ہلکے بلی کی طرح خراٹے لینے کی آواز آنے لگی۔ مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند نہ آنے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ مجھے ابھی تک یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ کوئی پتہ نہیں ریڈ انڈین ابھی تک میری تلاش میں وہاں بھی نہ آجائیں۔ مگر فلورا بے فکر ہو کر سو گئی۔ واقعی یہ زندہ قومیں ہیں۔ ان لوگوں کو جنگلوں میں' چٹانوں اور غاروں میں بھی نیند آ جاتی ہے جبکہ ہمیں سونے کے لئے بڑا انتظام کرنا پڑتا ہے۔

جنگل کی تنہائی' تاریکی اور سناٹا بھی مجھے ڈرا رہا تھا۔ میں نے وہیں دیوار کے ساتھ سر لگا کے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوششیں کرنے لگا۔ اسی طرح سوتے جاگتے باقی

رات بھی گزر گئی اور درختوں اور اوپر آسمان پر تو گہرے بادل چھائے ہوئے تھے' ان میں صبح کا اجالا جھلکنے لگا۔ میں نے فلورا کو جگادیا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"کیا صبح ہوگئی؟"

"ہاں فلورا۔۔۔۔"

اس نے آسمان اور درختوں کی طرف دیکھا۔

"اب ہمیں نکل چلنا چاہیے۔"

"کیا تمہیں راستے کا کچھ اندازہ ہے فلورا؟"

میں نے اس سے پوچھا۔ وہ شگاف سے باہر نکل آئی تھی اور اپنے سر پر رومال کو کھول کر دوبارہ باندھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں ان جنگلوں میں پہلے کبھی نہیں آئی لیکن مجھے اندازہ ضرور ہے کہ اگر ہم نے ان جنگلوں میں اپنا رخ صحیح رکھا تو کل تک فرنچ گیانا کے بارڈر تک ضرور پہنچ جائیں گے۔"

اسکا مطلب تھا کہ ہمیں ابھی دو دن ان گھنے خطرناک اور طرح طرح کے حشرات الارض اور درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں مزید دو دن سفر کرنا تھا۔ ابھی جنگل میں ہمیں ایک رات اور بسر کرنی تھی۔ برازیل کے جنگلوں میں میں چیونٹیوں اور مچھروں کا عادی ہو گیا تھا۔ جہاں چیونٹی کاٹتی میں اسے وہیں کچل دیتا تھا۔ لیکن ابھی تک میرا یہاں کی سیاہ اور سرخ چیونٹیوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ان کے نام سے ہی میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ یہ وہ چیونٹیاں ہیں کہ اگر آدمی کے بدن پر ذرا سا زخم آجائے اور وہاں سے خون بہہ نکلے تو یہ چیونٹیاں خون کی بو پاکر اگر قریب ہوں تو فوج در فوج وہاں آجاتی ہیں اور زخمی آدمی پر ہلہ بول دیتی ہیں۔ اگر آدمی ان کی زد سے بھاگ سکتا ہو تو بھاگ جاتا ہے ورنہ یہ چیونٹیاں آدمی کے جسم پر چڑھ کر اسکا

سارا گوشت کھا جاتی ہیں۔ اس طرح مجھے آدم خور درختوں اور مگر مچھوں کا بھی ڈر تھا۔

میں نے جب اسکا ذکر فلورا سے کیا تو وہ بولی۔

"یہ خطرے تو اپنی جگہ پر موجود رہیں گے۔ ہمیں ان سے بچ کر سفر کرنا ہو گا۔ ہمیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی"۔

میں نے کہا۔

"مگر مجھے تو آدم خور درخت کی بالکل پہچان نہیں ہے۔"

وہ بولی۔

"مجھے ہے۔ آجاؤ۔"

بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ درخت گیلے تھے۔ گھاس گیلی تھی۔ ہم ایک بار پھر گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ یہ کس قسم کے ہیبت ناک جنگل تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ان جنگلوں میں دن کی روشنی بہت کم پہنچ پاتی تھی۔ درختوں نے اوپر جاکر آپس میں گتھم گتھا ہو کر سبز رنگ کی چادر ڈال رکھی تھی۔ بوندا باندی ان درختوں کی چھت پر ہو رہی تھی جس کی آواز آجاتی تھی مگر بارش کا پانی نیچے نہیں گر رہا تھا۔ بلکہ جنگل میں مسلسل اسکا ٹپکا لگا ہوا تھا۔ درختوں کے تنے اتنے بڑے بڑے تھے کہ چار پانچ آدمی اگر ایک دوسرے سے ملا کر ان درختوں سے بغل گیر ہوں تب بھی ان کے ہاتھ تنے کی دوسری طرف نہیں پہنچتے تھے۔ ان ہاتھوں سے کئی گنا موٹے تنے والے درختوں پر سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ ان کی شاخیں اوپر سے نیچے لٹک کر زمین کو چھو رہی تھیں اور کئی شاخوں نے وہیں زمین میں جڑیں پکڑ لی تھیں۔ درختوں کے اردگرد سبز اور سنہرے پتوں والی جنگلی جھاڑیاں بے تحاشا بڑھی ہوئی تھیں۔ ان درختوں پر جانور اور پرندے عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکال کر بول رہے تھے۔ کئی جگہوں پر ہم نے درختوں کے ساتھ سبز رنگ کے سانپ لٹکتے دیکھے۔ ایک جگہ دریائی

ندی آگئی۔ یہ ندی آگے جاکر دریائے ایمزن میں مل جاتی تھی۔ ندی کے آدھے پاٹ کو جھکے ہوئے درختوں نے ڈھانپ رکھا ہوا تھا۔ ہم نے آدھی ندی پانی میں چلتے ہوئے اور آدھی ندی درختوں کی شاخوں کو پکڑ پکڑ کر عبور کی۔ ایک جگہ ہمیں کتنے ہی مگرمچھ ندی کے کنارے ریت اور کیچڑ میں لیٹے ہوئے ملے۔ فلورا وہیں رک گئی۔ کہنے لگی۔

"آواز مت نکالنا۔ خاموشی سے گزرتے چلو۔"

میں بالکل سیدھا اور خاموش ہو کر دبے دبے قدم اٹھاتا جھاڑیوں میں سے گھر گیا۔ ایک مگرمچھ نے شاید مجھے دیکھ کر یا جمائی لینے کی خاطر اپنا بھیانک دانتوں والا منہ کھول دیا۔ اس کے منہ سے ڈراونی پھنکار نکلی۔ فلورا نے مجھے بازو سے کھینچ لیا۔ میں اس کے ساتھ جالگا۔ وہ بھی شرما گئی اور میں بھی شرما گیا۔ مجھے تو خیر شرمانا ہی تھا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ فلورا جو ایک امریکی معاشرے میں پلی بڑھی لڑکی تھی' اسکا چہرہ ایک لمحے کے لئے کسی مرد کے جسم کے ساتھ لگنے سے سرخ ہو گیا تھا۔ امریکہ میں میں پہلے بھی کافی مدت گزار چکا تھا مگر میں نے اس قسم کی شرم و حیا وہاں کی عورتوں میں بہت کم دیکھی تھی۔ میں فلورا سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"فلورا! تمہارے خون میں مجھے اورینٹل خون کی آمیزش لگتی ہے۔ تمہارے ماں باپ کہاں کے رہنے والے تھے؟"

اس نے اپنی قمیض کے گریبان کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"میری والدہ تیونس کی رہنے والی تھی اور میرا باپ اطالوی تھا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"پھر تو تمہارے اندر ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اورینٹل خون گردش کر رہا ہے۔ اطالوی معاشرے پر مراکش اور الجزائر کی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر ہے' اس لئے تم میرے ساتھ لگنے سے شرما گئی تھی۔"

فلورا بہرحال امریکہ میں پیدا ہوئی تھی اور اسی معاشرے میں بڑی ہوئی تھی۔ اس نے بے باکی سے پوچھا:

"کیا تم عورت کی شرم و حیا کو پسند نہیں کرتے؟ کیا تمہیں میرا جسم اپنے جسم سے لگنا اچھا نہیں لگا؟ مجھے تو اچھا لگا تھا۔۔۔۔"

اچھا تو مجھے بھی لگا تھا مگر میرے اندر کی منافقت نے مجھے حقیقت کے اظہار سے روک دیا تھا اور میں منافقانہ باتیں کرنے لگا تھا۔ جب اس نے کچھ کھل کر بات کی تو میں نے جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے کہا:

"فلورا! بات یہ ہے کہ یہ باتیں قدرتی ہیں' ان کا عمل اور ردعمل قدرتی ہوتا ہے۔"

فلورا نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا:

"میں نے عمل اور ردعمل کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ سیکس کے معاملے میں یہ باتیں فضول ہوتی ہیں۔ جب سیکس کا اشارہ ملتا ہے تو اپنے آپ عمل اور ردعمل پیدا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ دوپہر ہو رہی ہے۔ مجھے پیاس اور بھوک بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ ہمیں جنگل میں اور خاص طور پر ایمزن کے جنگلوں میں جنگلی کیلے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

ہم آہستہ آہستہ جھاڑیاں ہٹاتے چلتے بھی جا رہے تھے۔ جب ہم کافی دور نکل آئے تو ذرا کھلی جگہ آگئی۔ یہاں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ہم نے ندی کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ فلورا کہنے لگی:

"میں کچھ کھانے کے لئے تلاش کر کے لاتی ہوں۔ تم یہیں بیٹھنا۔ ادھر ادھر مت جانا۔"

وہ چلی گئی۔ میں ندی کے بہتے پانی کو دیکھنے لگا۔ ندی کا پانی گہرا اور ریتلا تھا۔ یہ ندی دریا کی کسی شاخ سے نکلی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی ندی تھی۔ دوسرے کنارے کے درختوں کی شاخیں اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ یہاں آسمان پر چھائے ہوئے بادل صاف نظر آرہے تھے۔ بوندا باندی اب نہیں ہورہی تھی۔ ہوا میں پتوں' سبزے اور عجیب عجیب قسم کی گھاس اور جنگلی پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اکیلا بیٹھے بیٹھے مجھے یونہی وہم ہونے لگا جیسے ابھی کسی جھاڑی کے پیچھے سے کوئی ریڈ انڈین نکل کر سامنے آجائے گا اور مجھ پر زہریلا تیر چلادے گا۔ میں نے اسی طرف دیکھا جس طرف فلورا گئی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں سے میری طرف آتی نظر آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پکے ہوئے زرد کیلوں کا گچھا تھا۔ قریب آکر بیٹھ گئی۔

"خوش قسمتی سے قریب ہی جنگلی کیلوں کے درخت تھے۔ یہ شام تک کے لئے ہمارے لئے کافی ہوں گے۔"

اسی طرح ہم کیلے کھاتے دھرا دھر بہتی کسی ندی یا آبشار کا پانی پیتے سورج غروب ہونے تک چلتے رہے۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اس دوران ہمیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ فلورا ایک درخت کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس درخت کے تنے کے ساتھ فٹ بال جتنے بڑے تین چار پھل لگے تھے۔ فلورا نے مجھے قریب بلایا اور کہا:

"یہ برازیل کے جنگلوں کا ایک خاص پھل ہے۔ اس کے اندر بڑا میٹھا اور غذائیت سے بھرپور پانی ہوتا ہے۔"

پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے پھل توڑ لیا۔ میں نے دوسرا پھل توڑ لیا۔ ہم نے اس میں سوراخ کئے اور اس کا میٹھا پانی پیا۔ پانی کا ذائقہ ناریل کے پانی جیسا تھا۔ اس پانی نے ہمیں پھر سے تازہ دم کردیا۔ اب سورج ڈوب رہا تھا۔ جنگل میں شام سے پہلے اندھیرا اترنے لگا تھا۔ ہمیں رات گذارنے کا مسئلہ ایکبار پھر درپیش تھا۔۔۔ ہم نے

ایک جگہ سے ندی پار کی اور دوسرے کنارے پر آگئے۔ میں نے فلورا سے رات بسر کرنے کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگی:

"ہمیں زمین سے اونچی جگہ پر رات گذارنی ہوگی۔"

میں نے کہا:۔"کسی درخت پر جگہ بنالیتے ہیں۔"

وہ بولی:۔"ایسا کبھی بھول کر بھی نہ سوچنا۔ ان جنگلوں کے درختوں پر ایسی زہریلی چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں جو اپنے ڈنک سے آدمی پر بے ہوشی طاری کرتے ہیں' پھر مزے سے اس کا خون پینے لگتے ہیں۔ درختوں پر سانپ بھی رات کو چڑھ جاتے ہیں۔"

"تو پھر مجھے تو یہاں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی' جہاں ہم رات کاٹ سکیں۔"

فلورا نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کچھ فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ شام کے اندھیرے میں وہ گم ہوتا جارہا تھا۔ فلورا نے کہا:۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

ہم درختوں کی طرف چلے۔ یہ بڑے گھنے درخت تھے۔ ہم ان کے درمیان سے گذر کر دوسری طرف آئے تو سامنے رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ہمیں ایک چھوٹی سی پہاڑی کا ہیولا نظر آیا۔ فلورا نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمیں اس پہاڑی پر رات گذارنے کو ضرور جگہ مل جائے گی۔"

پہاڑی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس پر جھاڑیاں زیادہ اگی ہوئی تھیں۔ درخت کہیں کہیں تھے۔ ہم پہاڑی ٹیلے کی چوٹی پر آگئے۔ دوسرے طرف ٹیلے کی ڈھلان پر ہمیں ایک چار دیواری نظر آئی۔ فلورا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ چار دیواری کی چھت میں سے ایک مخروطی مینار باہر نکلا ہوا تھا۔ فلورا نے کہا:

"یہ برازیل کے جنگلی قبیلے کا پرانا معبد لگتا ہے۔ چلو اس کے اندر چل کر دیکھتے ہیں۔"

ہم ڈھلان اتر کر پرانے معبد کی چار دیواری کے پاس آ گئے۔ چار دیواری کئی جگہوں سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ ایک طرف کی دیوار آدھی گری ہوئی تھی۔ ہم وہاں سے چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ ابھی رات کا اتنا زیادہ اندھیرا نہیں چھایا تھا۔ چار دیواری کے اندر ایک چبوترے کی سیڑھیاں تھیں۔ چبوترے پر ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔

میں نے فلورا سے کہا:۔ "ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ یہ جگہ تو مجھے بھوتوں کا مسکن معلوم ہوتی ہے۔"

فلورا نے کہا:۔ "میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ دنیا میں کوئی بھوت پریت نہیں ہوتے۔ ہم اس کوٹھڑی میں ہی رات بسر کریں گے۔ اس سے اچھی جگہ ہمیں اور کہیں نہیں مل سکتی۔"

چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر ہم کوٹھڑی کے دروازے پر آ کر رک گئے۔ کوٹھڑی کے دروازے کی جگہ دیوار میں شگاف ہی بنا ہوا تھا۔ کوئی دروازہ یا اس کا کواڑ نہیں تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ فلورا بڑی دلیر لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئی۔ میں باہر ہی رہا۔ اندر سے فلورا نے آواز دی۔

"اندر آ جاؤ۔"

میں ڈرتے ڈرتے اندر چلا گیا۔ پہلے تو مجھے اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے فلورا دکھائی دی۔ وہ کوٹھڑی کی سامنے والی دیوار کے پاس کھڑی تھی۔ کہنے لگی:

"یہاں سیڑھیاں نیچے جاتی ہیں۔ نیچے چل کر دیکھتے ہیں کہ وہاں پر کیا ہے"

میں نے کہا:۔ "فلورا' خدا کے لئے اس وقت ایڈونچر کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ وقت ایڈونچر کا نہیں ہے۔ کہیں ہم واقعی کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔"

فلورا نے میری نصیحت پر ذرا بھی کان نہ دھرا۔ وہ یہ کہتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی:

"ڈرپوک کہیں کے۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے سیڑھیوں کے پاس جا کر نیچے دیکھا۔ نیچے اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ مجھے فلورا کہیں دکھائی نہ دی۔ اس کی آواز آئی۔

"نیچے آ جاؤ سلمان! یہاں یک طرف مجھے روشنی نظر آ رہی ہے۔"

میں اس خیال سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں واقعی ڈرپوک ہوں۔ نیچے ایک تھوڑی سی کھلی جگہ تھی۔ فلورا نے مجھے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں سے ایک اونچی چھت والی پہاڑی سرنگ دور تک چلی گئی تھی اور سرنگ کے آخری سرے پر روشنی ہو رہی تھی۔ شاید کسی نے کوئی چراغ وغیرہ روشن کیا ہوا تھا۔ میں نے فلورا سے کہا:

"یہاں ضرور کوئی نہ کوئی موجود ہے۔"

وہ بولی:۔ "اگر کوئی ہوتا تو اس وقت تک ہمارے سر پر پہنچ چکا ہوتا۔ میں ان جنگلوں کے وحشی لوگوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ چراغ کس نے جلا رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

فلورا نے کہا:۔ "جنگل کے لوگ بڑے توہم پرست ہوتے ہیں۔ یہ اس قسم کی جگہوں پر چراغ جلا کر چلے جاتے ہیں اور یہ مگرمچھ کی چربی والے چراغ کئی کئی دن تک جلتے رہتے ہیں۔ آؤ آگے چل کر دیکھتے ہیں۔"

ہم سرنگ میں چلتے روشنی کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ یہ روشنی واقعی ایک مٹی کے چراغ کی تھی جو پتھر کے ایک بت کے پاؤں میں کسی نے روشن کیا ہوا تھا۔ فلورا اور

میں بت کو غور سے دیکھنے لگے۔ یہ آدمی کی شکل کا بت تھا مگر اس کی آنکھیں بھیڑیئے کی آنکھوں سے ملتی جلتی تھیں اور دو دانت بھی باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں نے کہا:

"فلورا! یہ جنگلی لوگوں کے کسی دیوتا کا بت ہے۔ ہمیں اس کو نہیں چھیڑنا چاہئے۔ میری مانو اور یہاں سے نکل چلو۔"

فلورا نے میری طرف دیکھ کر کہا:

"سلمان! میں تو تمہیں بڑا بہادر اور پڑھا لکھا نوجوان سمجھتی تھی۔ پھر تم یکایک کیسی ان پڑھ جنگلیوں والی باتیں کرنے لگے؟ یہ دیوتا وغیرہ سب ان وحشی لوگوں کے دماغ کی اختراع ہیں۔ ان میں کوئی طاقت وغیرہ نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا:۔ "اچھا تم ہی ٹھیک کہتی ہو۔ مگر ہم یہاں بحث کرنے تو نہیں آئے۔ ہمیں رات گذارنے کے لئے جگہ کی تلاش ہے اور میری رائے میں یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

فلورا نے ضد کرتے ہوئے کہا:

"میں تو یہیں رات گذاروں گی۔ تم کسی دوسری جگہ جانا چاہتے ہو تو بے شک چلے جاؤ۔"

میں اسے چھوڑ کر اکیلا کہاں جاتا؟ اس اجاڑ جنگل میں ویسے ہی مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ فلورا تو ایسے لگتا تھا کہ ان جنگلوں میں ہی پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔ میں نے کہا:

"تو پھر کوئی سونے کے لئے جگہ تلاش کرو۔"

"یہاں تو یہی جگہ ہے۔"

فلورا چراغ کی روشنی میں جائزہ لینے لگی۔ یہ چراغ بت کی دائیں جانب دیوار کے طاق میں جل رہا تھا۔ اس کی بتی کافی جل چکی تھی۔ فلورا نے کالی سیاہ بتی کو دیکھ کر کہا:۔ "یہ چراغ کم از کم دو راتوں سے یہاں روشن ہے۔"

میں نے کہا:۔ "تمہیں آج رات ریڈ انڈین چراغ میں نئی بتی ڈالنے نہ آجائیں۔"

"ہم اس طرف چل کر دیکھتے ہیں۔ وہاں اوپر مجھے ایک کھتہ نظر آرہا ہے۔"

سرنگ ذرا آگے جاکر بند ہوگئی تھی۔ لیکن اوپر پہاڑی میں ضرور کوئی خفیہ شگاف تھا جس میں سے تازہ ہوا سرنگ میں برابر آرہی تھی۔ اس تازہ ہوا کی آکسیجن کی وجہ سے چراغ بھی روشن تھا۔ ہم نے ذرا آگے جاکر دیکھا۔ زمین سے کوئی تین چار فٹ اونچا دیوار میں ایک کھتہ بنا ہوا تھا۔ فلورا بولی۔

"مجھے اوپر چڑھاؤ۔"

میں نے اسے کھتے میں چڑھا دیا۔ وہ کھتے میں غائب ہوگئی۔ پھر سر نیچے نکال کر بولی۔

"اوپر آجاؤ۔ اوپر بہت جگہ ہے۔"

میں بھی اوپر چڑھ گیا۔ کھتہ کافی چوڑا تھا۔ وہاں دو آدمی بڑی آسانی سے لیٹ سکتے تھے۔ اس کی چھت بھی تین چار فٹ اونچی تھی۔ فلورا بڑے آرام سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر لیٹ گئی۔

"بس اس سے بہتر جگہ ہمیں سارے جنگل میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہاں مچھر بھی نہیں ہیں اور تازہ ہوا بھی آرہی ہے۔ اوپر ان لوگوں نے کوئی شگاف ڈال رکھا ہے۔ ایمزن میں اس قسم کی سرنگیں عام ہوتی ہیں۔"

میں بھی اس کے سامنے والی دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا۔ چلنے سے کافی تھکان ہوگئی تھی مگر نیند کوسوں دور تھی۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ فلورا اپنے دوست جونی کی باتیں کرنے لگی۔

"وہ مجھے بہت پسند تھا۔ اس کی موت سے مجھے بڑا صدمہ ہوا تھا۔ مگر اس کی قسمت میں ایسے ہی مرنا لکھا تھا۔"

میں نے پوچھا۔

"تمہیں وہ یاد تو بہت آتا ہو گا۔"

کھتے میں نیچے جلنے والے چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ مگر روشنی کھتے کے دہانے تک ہی آتی تھی۔ فلورا نے کہا۔

"کبھی کبھی یاد آتا ہے۔"

میں نے مشرقی انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا کہ تم نے جونی سے شادی نہیں کی تھی۔ تمہارے بچے ہو گئے ہوتے تو وہ تمہیں بہت یاد آتا۔ تمہارے بچے بھی اپنے باپ کی کمی محسوس کرتے۔"

فلورا نے بے نیازی سے کہا۔

"شادی ہو جاتی تو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ شادی تو ہماری ہو ہی گئی تھی۔ ہم میاں بیوی کی طرح رہ رہے تھے۔ بس گرجا جا کر نکاح نہیں پڑھا تھا۔ اور بچے تو ہم نے خود ہی پیدا نہیں کیے۔"

"کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہارے بچی ہوں جو تمہیں ماما کہہ کر پکاریں۔؟"

"بالکل نہیں۔ مجھے ماما بننا بالکل پسند نہیں۔ میں نے جونی کے ساتھ رہنے سے پہلی ہی اسے کہہ دیا تھا کہ میں اسی صورت میں اس کے ساتھ رہوں گی کہ ہمارے ہاں کوئی بچہ نہین ہو گا۔"

"مگر تم اس سے محبت تو ضرور کرتی ہو گی۔؟" میں نے پوچھا۔

فلورا کا چہرہ مجھے دھندلی روشنی میں سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"محبت جس طرح تم مشرقی لوگ کرتے ہو' اس طرح بالکل نہیں کرتی تھی۔ مین نے پڑھا اور سنا بھی ہے کہ تم لوگ محبت میں خودکشی بھی کر لیتے ہو۔"

میں نے کہا:۔ "ایسے واقعات تو تمہارے امریکہ اور یورپ مین بھی ہوتے ہیں۔"

"بہت کم ہوتے ہیں۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں لڑکے لڑکی کی محبت کا تصور مشینی ہے۔ اگر مشین کا کوئی پرزہ خراب یا ٹوٹ جاتا ہے تو ہم اسکا پرزہ بدل دیتے ہیں۔ یا پوری مشین اٹھا کر ٹریش کین میں ڈال دیتے ہیں۔ تم لوگوں کی طرح ہم محبت میں زندگی ختم تو نہیں کیا کرتے۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم نہیں سمجھتی کہ تم محبت کی اصل روح سے محروم ہو؟"

فلورا طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"روح کیا ہوتی ہے؟ میں کسی روح کو اور خاص طور پر محبت کی روح کو تسلیم نہیں کرتی۔ جب تک ایک لڑکا ایک لڑکی کے ساتھ رہتا ہی ٹھیک ہے۔ جب وہ چلا جاتا ہے تو لڑکی کو کوئی دوسرا تلاش کر لینا چاہیے۔"

میں نے سوچا کہ اس عورت سے بحث فضول ہے۔ یہ یورپ اور امریکہ کے لوگ روح کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے گفتگو کا موضوع تبدیل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"فلوریڈا پہنچ کر تم ضرور کوئی دوسرا بوائے فرینڈ تلاش کر لو گی۔"

فلورا نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اپنے آپ کوئی بوائے فرینڈ مل جائے گا۔ تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟"

اس کے سوال پر میں بوکھلا گیا۔ میری واقعی کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی۔ اپنے وطن میں ضرور ایک لڑکی سے محبت تھی لیکن جب اسکی کسی دوسری جگہ شادی ہو گئی تو میں نے اسکا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایک تھی مگر اس کی شادی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی گرل فرینڈ نہیں بنائی۔ اور اب تو میری بھی شادی ہو چکی ہے بس میری بیوی ہی میری گرل فرینڈ ہے۔"

فلورا ہنس پڑی۔

"بیوی بیوی ہوتی ہے۔ گرل فرینڈ گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ اچھا تم ایسا کرو۔ مجھے اپنی گرل فرینڈ بنالو۔ میں بھی تمہیں اپنا بوائے فرینڈ بنالیتی ہوں۔ مگر پھر تمہیں میامی میں ہی میرے پاس رہنا پڑے گا۔ میں تمہیں واشنگٹن نہیں جانے دوں گی۔"

میں جھینپ سا گیا۔

"تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے اس لائق سمجھا۔"

وہ میرے قریب آگئی۔

"شکریہ کس بات کا۔ تم میری طرح جوان ہو۔ مرد ہو۔ میں بھی جوان ہوں۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے تو اس میں ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنے والی کیا بات ہے۔"

اس نے اپنا بازو میری گردن میں حائل کر دیا۔

"مجھے تم ویسے شروع سے ہی اچھے لگتے ہو۔ بوائے فرینڈ کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ وہ گرل فرینڈ کو اچھا لگے۔ تم اپنا بازو میری گردن میں کیوں نہیں ڈال رہے؟ کیا شرما رہے ہو؟ تم مشرقی لوگ بڑے شرمیلے ہوتے ہو۔ اور وہاں بھی شرمانے لگ جاتے ہو جہاں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

آخر میں بھی مرد تھا۔ کہاں تک ضبط کرتا۔ کوئی نیک پارسا بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ ہمارے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ ابھی اس جنت میں داخل ہوئے ہمیں ایک سیکنڈ ہی گزرا ہو گا کہ کچھ آوازیں سنائی دیں۔ ہم جلدی سے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

"کوئی اندر آرہا ہے۔"

"فلورا یہ کہہ کر جلدی سے کھتے میں سے نیچے دیکھنے لگی۔ آوازیں باہر سے آرہی تھیں اور آہستہ آہستہ قریب ہوتی جارہی تھیں۔ یہ آدمیوں کے گیت گانے کی آوازیں تھیں۔ فلورا نے ماتھا پکڑ لیا۔

"ریڈ انڈین یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ مگر تم گھبرانا نہیں۔ یہ ہمارے قبیلے کے ریڈ انڈین نہیں ہیں۔ ان کے گیت دوسرے قبیلے کے ہیں۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"مگر یہ تو سرنگ کے اندر آرہے ہیں۔"

"ہاں۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے کہ نیچے جو بت لگا ہوا ہے یہ لوگ اس کی پوجا وغیرہ کے لئے آرہے ہیں۔ ہمیں اس جگہ پر چھپے رہنا ہو گا۔ وہ لوگ سرنگ کے اندر آچکے ہیں۔"

ہمیں سرنگ کی اس جانب سے جہاں سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں، مشعلوں کی روشنیاں لہراتی نظر آنے لگیں۔ آدمیوں کے بھجن گانے کی آوازیں بھی بہت قریب آگئی تھیں۔ فلورا نے مجھے بازو سے پیچھے کھینچ کر کہا۔

"فرش پر لیٹ جاؤ۔ سر بالکل باہر نہ نکالنا۔"

ہم دونوں فرش پر اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔ ہم کھتے میں اس جگہ لیٹے تھا جہاں اندھیرا تھا۔ نیچے سے اگر کوئی دیکھتا تو ہم اسے نظر نہیں آسکتے تھے۔ پھر ہم نے ریڈ انڈین قبیلے کے چار پانچ آدمیوں کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو بھی کھینچتے ہوئے لارہے تھے جس کے دونوں بازو رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ فلورا نے میرا ہاتھ آہستہ سے دبا کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

"خدا کے لئے کوئی آواز مت نکالنا۔ معاملہ خطرناک لگتا ہے۔"

ہم کھتے کے کنارے سے تھوڑا سا سراوپر کئے دیکھ رہے تھے۔ پانچ ریڈ انڈین بھجن گاتے ایک کھلے بالوں والی لڑکی کو کھینچتے ہوئے چلے آئے رہے۔ انہوں نے بت کے سامنے اس لڑکی کو ڈال دیا اور خود بت کے آگے جھک گئے۔ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ لڑکی ریڈ انڈین لگتی تھی۔ اس کا رنگ زردی مائل سانولا تھا۔ سر پر سرخ رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی= گلے میں لمبا کرتا تھا۔ جنگلی آدمیوں نے سراوپر اٹھا لئے تھے۔ ان میں سے ایک ریڈ انڈین' جو بوڑھا آدمی تھا' بت کے سامنے آکر اونچی آواز میں کچھ پڑھنے لگا۔ اس دوران باقی ریڈ انڈین وحشیوں نے لڑکی کو بت کی دونوں ٹانگوں کے ساتھ اس طرح باندھ دیا کہ لڑکی صرف سرہلا سکتی تھی۔ خوف کے مارے لڑکی کا برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے ذرا اپنا سر آگے کیا تو فلورا نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچ لیا اور خود بھی پیچھے ہوگئی۔ اب ہم دونوں کھتے میں اپنے سرفرش کے ساتھ لگائے پتھر بن کر اوندھے لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ نیچے ریڈ انڈین لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ ایک دو ریڈ انڈین کے ہاتھوں میں میں نے لمبے لمبے چھرے دیکھے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی جنگلی کو ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ اوپر کھتے میں کوئی چھپا ہوا ہے تو پھر ہماری خیر نہیں۔ وہ لوگ ہمیں زندہ ہرگز نہ چھوڑتے۔

فلورا بالکل میرے ساتھ لگ کر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کا چہرہ ایک دوسرے کی طرف تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کا دھندلا دھندلا چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنا بازو میری کمر کے اوپر ڈال رکھا تھا۔ مجھے اس کے دل کی تیز دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ بھی سہمی ہوئی تھی اور اس خیال سے خوف زدہ تھی کہ اگر ہم پکڑے گئے تو ہمارا زندہ بچنا محال ہو گا۔ نیچے ریڈ انڈین اونچی آواز میں بھجن گانے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی آوازیں دور ہونے لگیں۔ پھر ایسا لگا جیسے وہ سرنگ سے باہر جا

رہے ہیں۔ میں نے آہستہ سے اپنا چہرہ آگے کھسکا کر ذرا سا سر اٹھا کر نیچے دیکھا۔ ریڈ انڈین دیوتا کے بت کے آگے سے جا رہے تھے۔ ان کی آوازیں اب دور سے آرہی تھیں۔ میں نے فلورا کا بازو دبایا۔ اس نے سر اٹھا کر نیچے دیکھا۔ اس وقت سارے ریڈ انڈین وہاں سے جا چکے تھے۔ فلورا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ابھی کوئی آواز مت نکالنا۔"

وحشی ریڈ انڈین کی آواز جب دور ہوتے ہوتے بالکل غائب ہوگئی تو ہم نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ ابھی تک دیوتا کے پتھر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ سر آگے کو جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ دہشت کے مارے بے ہوش ہو چکی تھی۔ فلورا نے آہستہ سے کہا۔

"ابھی ہمیں نیچے نہیں اترنا چاہیے۔ وہ لوگ باہر ہی ہوں گے۔"

ہم دس پندرہ منٹ تک باہر کی آوازوں پر کان لگائے وہیں کھتے میں لیٹے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فلورا نے نیچے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ لوگ تھوڑی دیر بعد واپس آجائیں۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"میرا خیال ہے ہمارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

"نیچے آجاؤ۔"

ہم دونوں کھتے میں سے نیچے اتر گئے۔ لڑکی اسی طرح بت کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ فلورا نے اس کے سر کو اوپر اٹھایا۔ لڑکی نیم بے ہوش تھی۔ فلورا نے کہا۔

"اسکی رسی کھولو۔"

ہم نے مل کر لڑکی کی رسی کھولی اور اسے زمین پر لٹا دیا۔ لڑکی کو ہوش آگیا۔ اس نے خوف زدہ آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور ہسپانوی زبان میں بولی۔

"مجھے نہ مارنا۔ مجھے نہ مارنا۔"

فلورا ہسپانوی زبان جانتی تھی۔ یہ زبان سارے جنوبی امریکہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس نے مجھے انگریزی میں ترجمہ کر کے بتایا۔ فلورا نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

"کیا تم انگریزی جانتی ہو؟"

لڑکی نے شکستہ انگریزی میں جواب دیا۔

"پلیز! مجھے نہ مارنا۔ مجھے گھر جانے دو۔"

فلورا نے اسے کہا۔

"ہم تمہیں مارنے نہیں آئے۔ ہم تمہیں تمہارے گھر لے جانے آئے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ۔"

لڑکی کے اندر خدا جانے کہاں سے طاقت آگئی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ فلورا کے دونوں ہاتھ تھام کر شکستہ ہسپانوی انگریزی میں التجائیں کرنے لگی۔

"پلیز سینوریتا۔ مجھے میرے گھر جانے دو۔ مجھے میرے گھر لے چلو۔"

فلورا نے اسے تسلی دی۔

"حوصلہ رکھو۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہمارے ساتھ آؤ۔"

ہم اسے لے کر سرنگ سے باہر ریڈ انڈین معبد کے چبوترے پر آگئے۔ باہر جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔ فلورا نے گہری آنکھوں سے آس پاس کا جائزہ لیا۔ لڑکی سہمی ہوئی اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں اس کے دائیں جانب کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"لگتا ہے وہ لوگ یہاں سے دور جا چکے ہیں۔ شاید وہ یہاں لڑکی کے پاس دن کے وقت دوبارہ آئیں۔ ہمیں یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔"

فلورا نے لڑکی کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔

"آجاؤ۔۔۔"

ہم دونوں چبوترے کی سیڑھیاں اترے اور جنگل میں گھس گئے۔ فلورا ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔ کیونکہ اسے جنگل کا وہ راستہ معلوم تھا جو اوپر شمال کی جانب فرنچ گیانا کی سرحد کی طرف جاتا تھا۔ ہم اندھیرے اور نیم اندھیرے میں جتنی تیز چل سکتے تھے، چل رہے تھے۔ جھاڑیاں ہمارے راستے میں آرہی تھیں۔ درختوں کی شاخیں ہمارے چہروں کے سامنے آجاتیں۔ ہم انہیں ایک طرف ہٹاتے جنگل میں بڑھتے جا رہے تھے۔ لڑکی ہمارے ساتھ ساتھ چل ہی تھی۔ جب ہم چلتے چلتے کافی دور نکل آئے تو میں نے فلورا سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے ناں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

فلورا نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ہم درست راستے پر جا رہے ہیں۔"

ہم سانس لینے کے لئے رک گئے۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ اب ہمارے پیچھے آئیں تو ہمیں نہیں پکڑ سکتے۔ ہم کافی دور آگئے ہیں۔"۔ میں نے کہا

فلورا بولی۔ "تم ریڈ انڈین کو نہیں جانتے۔ ہم ان سے کبھی بھی دور نہیں ہوتے۔ وہ جب چاہیں کسی جگہ سے بھی نمودار ہو سکتے ہیں۔"

فلورا اب لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہ لوگ اسے کہاں سے پکڑ کر لائے ہیں۔ لڑکی نے شکستہ ہسپانوی ملی انگریزی میں جواب دیا۔

"میرا نام مراچی ہے۔ میرا تعلق برازیل کے القاچی نامی ریڈ انڈین قبیلے سے ہے جو دریا پار آباد ہے۔ ریڈ انڈین ہمارے دشمن قبیلے کے آدمی تھے۔ میں اپنی بہن کے گھر دریا پار کر کے آئی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے حملہ کر کے میری بہن کو شدید زخمی کر دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ لوگ یہاں تمہیں کس لئے لائے تھے؟"

مراچی نے کہا۔

"اگر ریڈ انڈین کا کوئی خونخوار قبیلہ اپنے دشمن سردار کی سب سے چھوٹی بیٹی کو سورج دیوتا پر قربان کر دے تو دیوتا اس قبیلے سے بڑا خوش ہوتا ہے اور اس کو ڈھیر سارا اناج اور اس کے جانوروں کو دودھ دیتا ہے۔ یہ لوگ مجھے دیوتا پر قربان کرنے کے لئے لائے تھے۔"

"تو پھر انہوں نے تمہیں دیوتا پر قربان کیوں نہیں کیا؟"

میرے اس سوال پر مراچی نے کہا۔

"سورج دیوتا کی قربانی ہمیشہ سورج نکلنے کے بعد ہوتی ہے۔ یہ لوگ صبح سورج نکلنے کے بعد مجھے ہلاک کرنے والے تھے۔"

فلورا نے پوچھا۔

"کیا تم لوگ سورج دیوتا کی پوجا نہیں کرتے۔؟"

مراچی بولی۔

"ہم سورج کو ایک دیوتا ضرور سمجھتے ہیں مگر ہمارے قبیلے کا دیوتا دریا کا دیوتا یا کوما ہے۔"

میں نے فلورا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ریڈ انڈین سورج طلوع ہونے کے بعد وہاں آنے والے ہیں۔ اگر تمہارے خیال میں ریڈ انڈین ہر جگہ ہمارے قریب ہوتے ہیں تو ہمیں یہاں بالکل نہیں رکنا چاہیے۔"

فلورا نے مراچی سے پوچھا۔

"تمہارے قبیلے کا دریا کس طرف ہے؟"

اس نے اوپر درختوں کی طرف دیکھا۔ درختوں میں سے تھوڑا تھوڑا آسمان دکھائی دے رہا تھا اور آسمان پر بادل نہیں تھے۔ ریڈ انڈین لڑکی مراچی تاروں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک جانب اشارہ کیا اور بولی۔

"یہاں سے دریا اس جانب ہے۔ دریا کے پار جنگل میں ہمارا قبیلہ آباد ہے۔ میں درختوں سے اپنے جنگل کو پہچان لوں گی۔"

فلورا نے مجھے انگریزی میں کہا۔

"یہ لڑکی جس طرف اشارہ کر رہی ہے اگر ہم اس طرف گئے تو اپنی منزل سے دور ہو جائیں گے۔ مگر اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچانا بھی ضروری ہے ورنہ جنگلی اسے دوبارہ پکڑ لیں گے۔ اور صبح اس کی لاش کسی سرنگ میں پڑی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک خیال ہے تمہارا۔ چلو پہلے اسے اس کے ماں باپ کے پاس چھوڑ آتے ہیں۔ یہ اب ہمارا فرض بن گیا ہے۔"

ہم نے لڑکی کو ساتھ لیا اور جس طرف وہ اشارہ کر رہی تھی اس طرف چل پڑے۔ خدا کا شکر ہے اس طرف ابھی تک کوئی آدم خور درخت نہیں آیا تھا۔ ہم جھاڑیوں کے درمیان غور سے دیکھ دیکھ کر چل رہے تھے۔ ایک جگہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔

ریڈ انڈین لڑکی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"دریا کے پانی کی خوشبو اس طرف سے آئی ہے۔ ہم دریا کے پاس آ گئے ہیں۔"

کوئی آدھا گھنٹہ مزید چلنے کے بعد دریا آ گیا۔ یہاں دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دوسری طرف کنارے کے درختوں کے اونچے اونچے دھبے نظر آ رہے تھے۔ فلورا نے مجھ سے کہا۔

"تم نے کہا تھا مجھے تیرنا نہیں آتا۔ کیا تم دریا میں اتر سکو گے؟"

فلورا نے مراچی سے پوچھا۔

"کیا تمہیں تیرنا آتا ہے۔؟"

اس نے کہا۔

"ہاں مجھے تیرنا آتا ہے اور ہم دونوں اسے اپنے ساتھ تیرا کر لے جائیں گی۔ ہمیں دریا جلدی پار کرنا چاہیے۔ دریا ایک بار پار کر لیا تو میں اپنے دشمنوں سے محفوظ ہو جاؤں گی۔ کیونکہ دوسرے کنارے سے ہمارے قبیلے کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

میں ڈری ڈری نگاہوں سے اندھیری رات میں دریا کے بہتے پانی کو دیکھ رہا تھا جس میں یہ دونوں عورتیں مجھے دھکا دینے والی تھیں۔ لیکن یہ ان کی بھی مجبوری تھی اور میری بھی۔ سب سے پہلے فلورا دریا میں اتری۔ دریا کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ اس نے جھاڑیوں کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد ریڈ انڈین لڑکی مراچی دریا میں اتری۔ ان نے فلورا کا ایک ہاتھ تھام لیا تھا۔ فلورا نے مجھے کہا۔

"آجاؤ۔ جلدی کرو۔ ڈرو نہیں۔ میں بہت اچھی تیراک ہوں۔ میں تمہیں ڈوبنے نہیں دوں گی۔"

میں نے دریا میں پاؤں ڈال دیے۔ میں دریا میں گر سا گیا۔ دونوں عورتوں نے اپنا ایک ایک بازو میری گردن میں ڈال کر میرے سر کو اوپر اٹھا لیا اور خود دریا میں تیرنے لگیں۔ دریا کا پانی ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ دونوں عورتیں دریا کے بہاؤ کو کاٹتی ہوئی سامنے والے کنارے کی طرف تیر رہی تھیں۔ ان کا ایک ایک بازو اور دونوں دونوں ٹانگیں چل رہی تھیں۔ شروع شروع میں میرے منہ میں دریا کا پانی چلا گیا۔ پھر میں نے منہ بند کر لیا۔ میری ٹانگیں پانی کے زبردست بہاؤ کے ساتھ ایک طرف جھولتی جا رہی تھیں۔ میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ دونوں عورتیں بڑی اچھی تیراک ہیں اور یہ مجھے ڈوبنے نہیں دیں گی۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ مراچی نے دونوں بازو پھیلا کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میرے قبیلے کی حد شروع ہو گئی ہے۔ اب یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔"

وہ جنگل میں آگے آگے چلنے لگی۔ وہ ایک ماہر گائیڈ کی طرح ہمیں لئے جا رہی تھی۔ یہاں جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا۔ اسے چونکہ سارے راستے کا علم تھا اس لئے رات کا اندھیرا اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم ایک جوہڑ کے نزدیک پہنچ گئے۔ مراچی نے کہا۔

"اس جوہڑ میں بڑے خطرناک مگرمچھ رہتے ہیں۔ میرے پیچھے پیچھے رہنا"

وہ ہمیں جوہڑ سے دور رہ کر دوسری طرف نکال کر لی گئی۔ آگے پھر ایک ندی آ گئی۔ مگر یہ ندی چھوٹی تھی۔ پانی گھٹنوں تک تھا۔ ندی کے پار چھوٹے چھوٹے مخروطی ٹیلے تھے۔ ایک ٹیلے کے قریب سے گزرے تو ریڈ انڈین لڑکی ایکدم رک گئی اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ہم وہیں جھاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ مراچی کان لگا کر تاریک جنگل کے سناٹے میں جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے میں سن کی آواز آئی اور جیسے کوئی تیر ہمارے اوپر سے ہو کر نکل گیا ہو۔

ریڈ انڈین لڑکی نے اپنی زبان میں بلند آواز میں کچھ کہا۔ اس آواز نے گویا جادو کا اثر کیا۔ اندھیرے میں سے چھ سات ریڈ انڈین نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ خوشی سے اچھل رہے تھے۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی مراچی کے آگے جھک کر اس کی تعظیم کی۔ وہ اونچی آواز میں خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ مراچی بھی ان کی زبان میں کچھ کہتی جا رہی تھی۔ پھر انہوں نے ہمارے آگے بھی تعظیم سے سر جھکا دیے۔ اب وہ ہمیں جلوس کی شکل میں لے کر چل پڑے۔ تھوڑی دور تک جانے کے بعد ایک کھلی جگہ پر اندھیرے میں کتنے ہی جھونپڑے نظر آئے۔ ایک جھونپڑے کے باہر

مشعل روشن تھی۔ ریڈ انڈین جو ہمیں لے کر جا رہے تھے 'نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ دوسرے ریڈ انڈین مرد اور عورتیں بھی جھونپڑوں سے باہر نکل آئے۔ پھر مشعل والے جھونپڑے سے ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک عورت باہر آئے۔ یہ دونوں مراچی کے ماں باپ تھے۔ انہوں نے مراچی کو اپنے سینے سے لگالیا۔ مراچی نے انہیں ہمارے بارے میں بتایا۔ بوڑھے ماں باپ نے ہمارے ماتھے باری باری چومے اور ہمیں اپنے جھونپڑے میں لے گئے۔ یہ جھونپڑا اندر سے کافی کھلا تھا اور دریاں بھی بچھی ہوئی تھیں۔ اندر بھی ایک مشعل روشن تھی۔ ہمارے لئے پھل کیلے کے پتوں پر سجے ہوئے آگئے۔ ان کے ساتھ مکئی کی میٹھی روٹیوں کے ٹکڑے بھی تھے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر یہ چیزیں کھائیں۔ ہمارے لئے الگ الگ دو جھونپڑوں میں سونے کا انتظام کر دیا گیا۔ اور ہم سونے کے لئے چلے گئے۔

اس کے بعد میں سویا تو مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ دوسرے روز کافی دن چڑھے اٹھا۔ باہر سے ریڈ انڈین کے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ جنگل ہرا بھرا تھا۔ ایک جگہ جھونپڑوں کے درمیان الاؤ جل رہا تھا۔ الاؤ کے اوپر لوہے کی سلاخ میں ایک گائے بھونی جا رہی تھی۔ ریڈ انڈین اس کے گرد اپنے مخصوص انداز میں رقص کر رہے تھے۔ سامنے ایک اونچے تخت پر مراچی اپنے ماں باپ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ایک طرف فلورا بھی بیٹھی تھی۔ مجھے بھی بڑے احترام سے وہاں بٹھادیا گیا۔ ہم نے پھل اور گائے کے گوشت کا ناشتہ کیا۔

اس طرح ہمیں وہاں رہتے ہوئے جب تین چار روز گزر گئے اور قسم قسم کے کھانوں، اور آرام سے ہماری کھوئی ہوئی توانائی بحال ہو گئی تو فلورا نے مراچی کے باپ سے اجازت مانگی اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ سکیں۔ اس کے باپ نے اپنی بیٹی مراچی سے کچھ کہا۔ مراچی نے اسکا ترجمہ کر کے کہا۔

"میرا باپ پوچھتا ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ۔"

فلورا نے کہا۔

"بس اتنا کریں کہ ہمیں فرنچ گیانا کی سرحد تک پہنچا دیں۔"

مراچی کے باپ نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مراچی نے کہا۔

"میرا باپ کہتا ہے کہ تم لوگ فکر نہ کرو۔ میرے آدمی تمہیں فرنچ گیانا کی سرحد پار کرا کر آئیں گے۔"

اگلے روز صبح صبح ہم مراچی کے ریڈ انڈین قبیلے سے رخصت ہو رہے تھے۔ ہمارے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ چھ ریڈ انڈین بطور گائیڈ ہمارے ساتھ جا رہے تھے۔ یہ چھ کے چھ خچروں پر سوار تھے۔ ہم بھی خچروں پر سوار ہو گئے۔ ہمیں بڑی عزت و احترام سے رخصت کیا گیا۔ ہم سے جدا ہوتے وقت ریڈ انڈین مراچی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ فلورا سے گلے لگ کر ملی۔ افسوس وہ مجھے گلے لگ کر نہ ملی۔ مجھ سے صرف اس نے ہاتھ ملایا اور میرا ماتھا چوما۔ مراچی کے سردار نے ہمیں کچھ قیمتی پتھر تحفے میں دیے۔ جن میں نیلم، زمرد اور پکھراج ایسے قیمتی پتھر بھی تھے۔ یہ چھوٹی سی تھیلی میں تھے۔ تھیلی فلورا نے اپنے ہاتھ میں رکھ لی تھی۔ مراچی نے کہا تھا۔

"اسے تم فرنچ گیانا کے شہر میں جا کر بیچ دینا۔ تمہیں کافی رقم مل جائے گی۔"

ہمیں آگے فلوریڈا تک پہنچنے کے لئے کرائے وغیرہ کی ضرورت تھی۔ ان قیمتی پتھروں کے مل جانے سے ہمیں اطمینان ہو گیا تھا کہ اب ہم آسانی کے ساتھ امریکہ پہنچ جائیں گے۔ ہم نے جنگل میں ایک بار پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ لیکن یہ سفر بڑا محفوظ تھا۔ ایک تو یہ کہ سارا علاقہ مراچی کے سردار باپ کا تھا دوسرے ہمارے ساتھ ریڈ انڈین محافظ بھی تھے۔ کھانے پینے کا سامان بھی ساتھ تھا۔ ایک دن اور ایک رات کا سفر طے

کرنے کے بعد ہم فرنچ گیانا کی سرحد پر پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمیں ایک ٹیلے کے دامن میں آکر اشاروں سے بتایا کہ آگے جو اونچے درخت اور ٹیلے نظر آرہے ہیں یہ فرنچ گیانا کے ملک کے ہیں۔

انہوں نے ایک یہ بڑی اچھی بات کی تھی کہ ہمیں فرنچ گیانا کا بارڈر کراس کرا دیا۔ انہیں جنگلوں میں تمام خفیہ راستوں کا پتہ تھا جن راستوں سے منشیات کی سمگلنگ ہوتی تھی۔ جب ہم فرنچ گیانا کے جنگل میں پہنچ گئے تو ریڈ انڈین محافظ ہم سے جدا ہو کر واپس چلے گئے۔ اب میں اور فلورا اکیلے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"خدا کا شکر ہے ہم نے بارڈر بھی کراس کر لیا ہے ورنہ یہاں مشکل پیش آسکتی تھی۔ اس ملک کے بارڈر پر سیکورٹی بڑی سخت ہے۔ یہاں سے کوکین وغیرہ بھاری مقدار میں امریکہ سمگل ہوتی ہے۔"

ہم بڑے اطمینان کے ساتھ جنگل میں چلے جارہے تھے۔ ہم اپنے آپ کو ہر طرح سے محفوظ سمجھ رہے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا۔ جیسے جیسے ہم آگے جارہے تھے جنگل ختم ہو رہا تھا۔ پھر ایک جگہ کھیت آگئے۔ یہاں خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ یہ کھیتوں کے درمیان لگی ہوئی تھی اور دور تک چلی گئی تھی۔ میں نے فلورا سے کہا کہ کہیں یہ بارڈر ایریا تو نہیں ہے؟ وہ بارڈر کو غور سے دیکھنے لگی۔

"نہیں۔ بارڈر تو ہم کراس کر آئے ہیں۔ یہ خاردار تار مویشیوں کے لئے لگائی گئی ہوگی۔"

ہم اس طرف چلنے لگے جدھر ہمیں دو چار مکان نظر آرہے تھے۔ فلورا خوش تھی کہ اب وہ بڑی آسانی سے فلوریڈا پہنچ جائے گی۔ میں بھی مطمئن تھا۔ ابھی ہم دور سے نظر آنے والے مکانوں سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ جس کچے راستے پر جارہے تھے اس پر

سامنے سے ایک جیپ نمودار ہوئی۔ جیپ ہمارے قریب آکر رک گئی۔ اس میں تین وردی پوش آدمی باہر نکلے۔ ان سب کے پاس مشین گنیں تھیں۔ انہوں نے اترتے ہی مشین گنوں کا رخ ہماری طرف کر دیا اور ہم سے فرانسیسی میں کچھ کہا۔ میں فرنچ زبان بالکل نہیں جانتا تھا۔ فلورا بھی نہیں جانتی تھی۔ اس نے انگریزی میں ان سپاہیوں سے پوچھا۔

"ہم ٹورسٹ ہیں۔ کیا بات ہے؟ کیا ہم نے کوئی قانون توڑا ہے؟"

ان میں سے ایک آدمی جو افسر معلوم ہوتا تھا اور سگار پی رہا تھا' سخت لہجے میں انگریزی میں بولا۔

"تم دونوں سمگلر ہو۔ ہمارے ساتھ جیپ میں بیٹھ جاؤ۔ بھاگنے کی کوشش کی تو زندہ نہ بچو گے۔"

ہم حیران پریشان ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہوں نے دھکے دے کر ہمیں جیپ میں بٹھالیا۔ جیپ وہیں سے مڑی اور تیز رفتاری سے چلتی ہوئی دور کے مکانوں میں سے ایک مکان کے احاطے میں آکر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ بارڈر کسٹمز کا آفس ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بارڈر ہم نے ضرور کراس کر لیا تھا مگر منشیات کی سمگلنگ کے پیش نظر بارڈر کے آگے کھیتوں میں بھی حکومت کی طرف سے خاردار تار لگادی گئی تھی جس کی دن رات نگرانی ہوتی تھی۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ جنوبی امریکہ منشیات کا گڑھ ہے۔ وہاں سے لاکھوں من کوکین ھیروئن ہر سال سمگل ہو کر امریکہ کو جاتی ہے۔ آفس میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والا کسٹم آفیسر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو تیز نگاہوں سے دیکھا اور انگریزی میں کہا۔

"تمہارا پیکج کہاں ہے؟"

پیکج سے مراد ہیروئن یا کوکین تھی یہ اس نے بعد میں ہمیں بتایا۔ فلورا نے کہا۔

"ہم سمگلر نہیں ہیں۔ ہم ٹورسٹ ہیں۔"

کسٹم آفیسر نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"تمہارے پاسپورٹ کہاں ہیں؟"

ہمارے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ بھی نہیں تھے۔ جب فلورا نے یونہی بہانہ بناتے ہوئے کہا کہ ہم جنگل میں بھٹک گئے تھے اور دو چار غنڈوں نے ہم سے ہمارے پاسپورٹ چھین لئے ہیں تو کسٹم آفیسر کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے فلورا کو بالوں سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ فلورا پیچھے دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ میں پہلے تو ڈر گیا۔ پھر میں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ تم لوگ ہمیں ناحق پریشان کر رہے ہو۔ ہم امریکی نیشنل ہیں۔ تمہارے ملک کی سیاحت کرنے آئے ہیں۔ ہم تمہاری شکایت فرنچ گیانا کے گورنر سے کریں گے۔ ابھی میں نے جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے زناٹے دار تھپڑ لگا اور میں بھی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ کسٹم آفیسر دھاڑا۔

"تم سمگلر ہو۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ بتاؤ مال کہاں چھپایا ہے؟"

میرے ہونٹوں کے کناروں سے خون بہہ رہا تھا۔

اسی وقت ہماری تلاشی لی گئی۔

فلورا کے پاس قیمتی پتھروں کی جو تھیلی تھی کسٹم آفیسر نے اسے کھول کر دیکھا تو بولا۔

"اوہ! تو تم قیمتی پتھروں کی سمگلنگ بھی کرتے ہو۔"

اس نے تھیلی اور قیمتی پتھر اپنے قبضے میں کر لئے اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ دو سپاہی ہمیں گھسیٹتے اور دھکے دیتے ہوئے برآمدے میں سے گزار کر کونے والے کمرے میں لے گئے جو ایک قسم کی حوالات تھی۔ دروازہ سلاخوں والا تھا۔ باہر ایک سنتری ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ہمیں اندر دھکیل کر دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ فلورا اپنے سر کے پچھلے حصے کو دبا رہی تھی۔ اس کے سر میں سخت چوٹ لگی تھی۔ میں بھی اس کے سر کو آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے لگی۔

"اب کیا ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہمیں عدالت میں لے جائیں گے تو ہم ساری بات صاف صاف ساری کہانی بیان کر دیں گے۔ جب جج کو معلوم ہوا کہ ہم سمگلر نہیں ہیں بلکہ مصیبت کے مارے ہیں تو وہ یقیناً ہماری رہائی کے آرڈر جاری کریں گے۔"

فلورا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں جانتے۔ یہ جگہ بڑی خطرناک ہے۔ یہاں کوئی قانون نہیں ہے۔ اگر انہوں نے ہمیں ڈیول آئی لینڈ بھیج دیا تو پھر سمجھ لو ساری زندگی ہم وہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔"

"ڈیول آئی لینڈ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کوئی جیل ہے؟"۔

فلورا جو ڈیول آئی لینڈ کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکی تھی' بولی۔

"ڈیول آئی لینڈ فرنچ گیانا کا جہنم ہے۔ اس ملک پر فرانس کی حکومت ہے۔ فرانس کے خطرناک چوروں' ڈاکوؤں' قاتلوں اور جرائم پیشہ افراد کو ڈیول آئی لینڈ جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ حکومت نے جس سیاسی لیڈر سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنی ہو اسے بھی ڈیول آئی لینڈ بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت سی کہانیاں اور مضمون پڑھ چکی ہوں۔ اس کے چاروں طرف سمندر ہے جو خونخوار شارکوں سے بھرا ہوا ہے۔ ڈیول آئی لینڈ میں قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے اور وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر دم توڑ دیتے ہیں۔"

فلورا نے جو باتیں بتائیں اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ ہم آزاد ہونے کے فوراً بعد ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ یا اللہ! جس طرح تو نے اتنی بڑی بڑی مصیبتوں سے مجھے نکالا ہے' اس مصیبت سے بھی نجات دلا دے۔ سوائے تمہارے میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ میں نے قمیض سے ہونٹوں کے کنارے جما ہوا خون صاف کیا اور سر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

فلورا پر بھی سخت مایوسی طاری تھی۔ ہم دونوں چپ تھے۔ حالت نے ایکدم تبدیل ہو کر ہمیں بہت بڑی مشکل سے دوچار کر دیا تھا۔ دن گزرتا چلا گیا۔ دوپہر کو ہمیں تھوڑی سی کھانے کو ڈبل روٹی اور سبزیوں کا سوپ دیا گیا۔ شام کو ہمیں اس حوالات

سے نکال کر ایک اور مکان کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہاں ہمارے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ رات کو ہمیں الگ الگ کر دیا گیا۔ فلورا کو سپاہی آ کر لے گئے۔ میں تنگ اور نیم اندھیرے کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہی بھوری مونچھوں والا کسٹم آفیسر دو سپاہیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھے ٹھڈوں اور تھپڑوں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے جسم کو سمیٹ لیا مگر میرا سارا جسم اس بے رحم شخص کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ بے تحاشا اور بغیر دیکھے مجھے مار رہا تھا۔ جب وہ تھک گیا تو ہانپتے ہوئے ایک طرف ہٹ گیا۔ میرا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ میں فرش پر ٹانگیں سینے سے لگائے کراہ رہا تھا۔

کسٹم آفیسر نے جھک کر مجھے گردن سے دبوچ لیا اور مجھے جھٹکے دے کر بولا۔

"تم نے ڈرگ کہاں چھپائی ہے۔ جلدی بتاؤ نہیں تو تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

اس نے پستول نکال کر اسکی نالی میری کنپٹی سے لگا دی۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"میں سمگلر نہیں ہوں۔"

پھر درد سے نڈھال ہو کر میں نے اسے ساری کہانی بیان کر دی۔ اس نے میری داستان غم سن کر میری پسلیوں میں زور سے ٹھڈا مارا۔ میں دہرا ہو گیا۔ وہ یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔

"میں تمہیں سوچنے کے لئے کچھ وقت دیتا ہوں۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جب میں واپس آؤں تو مجھے بتا دینا کہ تم نے پیکج کہاں چھپایا ہے اور تمہارا ایجنٹ کون ہے۔"

میری بلا جانے کہ میرا ایجنٹ کون ہے۔ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں تھا۔ آفیسر چلا گیا۔ میں بیٹھ کر درد سے کراہنے لگا تھا۔ خدا جانے فلورا کا یہ کیا حال کر رہے تھے۔ عورت کے ساتھ ایسے موقع پر تو مرد بڑی درندگی کا سلوک کرتے ہیں۔ لیکن میں خود

مجبور بے بس تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس عقوبت خانے سے کب اور کیسے رہائی ملے گی۔ کیونکہ مجھ سے جو چیز طلب کی جارہی تھی وہ میرے پاس موجود ہی نہیں تھی اور میری سچی کہانی پر یہ لوگ اعتبار ہی نہیں کر رہے تھے۔

تین دن تک مجھ پر اس کمرے میں تشدد ہوتا رہا۔ اس قسم کا تشدد میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا جسم جگہ جگہ سے دکھنے لگا تھا۔ صرف ہڈیاں سلامت تھیں۔ آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے نظر آتا تھا۔ چوتھے دن وہ مجھے وہاں سے نکال کر ایک بند جیپ میں مویشیوں کی طرح ڈال دیا گیا اور جیپ کسی نامعلوم مقام کی طرف چل پڑی۔ خدا جانے کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی یہ جیپ ایک جگہ رک گئی۔ مجھے لوہے کی بیڑیاں پہنادی گئیں تھیں۔ مجھے باہر نکالا گیا تو سورج کی روشنی میں میری سوجی ہوئی آنکھیں چکاچوند سی ہوگئیں۔ میں نے دیکھا کہ سامنے سمندر لہریں مار رہا ہے۔ کنارے کے ساتھ ایک سٹیمر لگا ہے جس کے عرشے پر کچھ سپاہی بندوقیں لئے کھڑے ہیں۔ مجھے دو سپاہی گھسیٹتے ہوئے سٹیمر کی طرف لے گئے وہاں کچھ اور قیدی بھی پھٹے پرانے کپڑوں میں بیڑیاں پہنے سٹیمر پر سوار کئے جارہے تھے۔ مجھے بھی ان میں شامل کر دیا گیا۔ ان پر بھی تشدد کیا گیا تھا۔ کسی کا منہ سوجا ہوا تھا تو کسی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ان سب کا برا حال تھا۔ ہمیں ڈنڈوں سے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر سٹیمر پر چڑھا دیا گیا۔

سٹیمر کی نچلی منزل میں ایک تنگ سی جگہ تھی۔ ہمیں وہاں بٹھادیا گیا۔ ہم نے جسمانی تکلیف اور بیزاری و مایوسی کے عالم میں ایک دوسرے کے طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ سٹیمر کا انجن پہلے ہی سے چل رہا تھا۔ اب سٹیمر نے بھی چلنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے ساتھی قیدیوں کا جائزہ لینا چاہا مگر میری سوجی ہوئی آنکھوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سرسری طور پر دیکھنے سے مجھے قیدی جنوبی امریکہ کے لگے۔ ان میں دو تین کے رنگ گورے تھے جو اذیتیں برداشت

کرتے کرتے زرد ہو رہے تھے۔ سٹیمر سمندر میں چلا جارہا تھا۔ دروازے پر ایک سپاہی ہاتھ میں بندوق لئے کھڑا تھا۔ اس کے قریب جو قیدی بیٹھا تھا اس نے ہسپانوی زبان میں پہرے دار سے کچھ کہا۔ سپاہی نے غصے میں آکر اسے بندوق کا بٹ مار دیا۔ قیدی کی چیخ نکلی اور وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا۔ یا اللہ پاک! یہ میں کہاں آگیا ہوں؟ تو ہی میرا مددگار ہے۔ مجھے اس جہنم سے نکال دے۔ کوئی آدھے گھنٹے تک سٹیمر چلتا رہا۔ اس کے بعد ایسا لگا جیسے سٹیمر گھوم گیا ہو۔ پھر اس کی مشین کی آواز کم ہونے لگی اور اسے ہلکا سا دھچکا لگا اور انجن بند ہو گیا۔

اوپر آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

پہرے پر کھڑے سپاہی نے اوپر دیکھ کر فرانسیسیوں کسی سے کچھ کہا اور پھر ہمیں ہسپانوی زبان میں کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔ دوسرے قیدی کھڑے ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم اوپر آئے تو دیکھا کہ سٹیمر ایک پشتے کے ساتھ لگا ہوا ہے اور وہاں دو قطاروں میں سیاہ وردیوں والے گورے رنگ کے سپاہی بندوقیں لئے اٹن شن کھڑے ہیں۔ ان کے آگے ان کا ایک لال منہ والا افسر کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑا ہے۔ اس کے منہ میں سگار دبا ہوا ہے۔ کمر سے پستول لٹک رہا تھا اور ایک ہاتھ میں ہنٹر ہے جس سے ہمیں باہر لایا گیا۔ یہ لال منہ والا افسر قریب آیا اور اس نے قیدیوں پر بے دریغ ہنٹر چلانا شروع کر دیا۔ قیدیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دو چار ہنٹر مجھے بھی پڑے۔ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے چلا کر ہسپانوی زبان میں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

ہم لڑکھڑاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے چل پڑے۔ میرا جسم پہلے ہی چوٹوں کی وجہ سے درد کر رہا تھا۔ ہم اونچے درختوں اور گھنی جھاڑیوں والے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے سیاہ وردیوں والے سپاہی چل رہے تھے۔ کچھ دور

چلنے کے بعد آس پاس ٹیلے کی ڈھلانوں پر اور دامن میں مجھے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں دکھائی دیں جن کے آگے ہماری طرح کے زبوں حال پھٹے ہوئے گندے کپڑوں والے کمزور میلے کچیلے آدمی مشقت کر رہے تھے۔ کوئی زمین پر پھاوڑا چلا رہا تھا۔ کوئی آری سے درخت کاگرا ہوا تنا چیر رہا تھا۔ کوئی بیلچے سے زمین کھود رہا تھا۔ یہ سب ظاہر ہے ہماری طرح قیدی تھے۔ ان کے درمیان سیاہ وردیوں والے گورے سپاہی' جو فرانسیسی تھے اور جو خوب کھاپی کر صحتمند ہو رہے تھے' بندوقیں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ کچھ سپاہیوں کے ہاتھوں میں ہنٹر بھی تھے۔

ہمیں وہاں لاکر چھوڑ دیا گیا اور ہمیں ایک کرخت چہرے اور پھولے ہوئے گالوں والے ایک لال سرخ افسر نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ ایک جھونپڑے کے باہر میز کرسی لگائے بیٹھا تھا۔ دو قیدی اس کو پیچھے کھڑے پنکھے جھل رہے تھے۔ وہ باری باری ہمیں بلانے لگا۔ وہ ہر ایک کو بلاتا اور اس سے نام وغیرہ پوچھ کر ایک رجسٹر میں اندراج کرتا۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان لیتا اور جب جی چاہتا تو اٹھ کر دو چار ہنٹر بھی مار دیتا۔ جب میری باری آئی تو اس نے ہسپانوی زبان میں مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو اس نے میری طرف اپنی سنگدل ٹھنڈی آنکھوں سے دیکھا اور کچھ پوچھا۔ میں نے انگریزی میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

اس کو غصہ آ گیا۔ وہ اٹھا اور مجھے ہنٹروں سے پیٹنے لگا۔ میں چیخنا نہیں چاہتا تھا مگر درد سے میری چیخیں نکل گئیں۔ اس نے ہانپتے ہوئے ہنٹر اپنے ہاتھ کے گرد لپیٹا اور کہا۔

"حرامی! تو کہتا ہے تو ہماری زبان نہیں سمجھتا۔؟"

یہ جملہ اس نے انگریزی میں کہا تھا۔

"کیا تم مسلمان ہو؟"

میں نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔

"یس سر!"

وہ رجسٹر پر جھک گیا۔

"تم سمگلنگ کب سے کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"سر! میں سمگلر نہیں' ٹورسٹ ہوں۔"

اس نے اٹھ کر دوبارہ میری مرمت کرنی شروع کر دی۔ خدا خدا کر کے اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ پھر اس نے ایک کاپی پر میری انگلیوں کے نشان لئے اور مجھے زور سے دھکا دے کر بولا۔

"تمہاری تو میں ایسی خبر لوں گا کہ یاد ہی کرو گے۔ میرا نام بھی رچرڈ ہے۔ میں تو تم مسلمانوں کا کروسیڈ کے وقتوں کا دشمن ہوں۔"

اس ظالم سے رہائی ملی تو میں نے تھوڑا سکھ کا سانس لیا۔ میرا جسم اب مار کھاتے کھاتے پتھر ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم دوسرے قیدیوں کو کدھر لے جایا گیا۔ بہرحال مجھے ان قیدیوں میں جو وہاں پہلے سے مشقت کر رہے تھے' ایک درانتی ہاتھ میں تھما کر گھاس کاٹنے پر لگا دیا گیا۔ میں درد کی شدت کے باعث نڈھال ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ درانتی لے کر بے طرح اگی ہوئی گھاس پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک پہرے دار میری پیٹھ پر تڑاتڑ ہنٹر برسانے لگا۔ میں بلبلا اٹھا۔ اور میرا درانتی والا ہاتھ اپنے آپ ہی گھاس کاٹنے لگا۔

میرے اوپر جو خونخوار سپاہی پہرہ دے رہا تھا وہ دوسرے مشقتی قیدیوں کی خبر لینے آگے چلا گیا۔ وہاں دو قیدی کلہاڑیوں سے ایک درخت کاٹنے لگے ہوئے تھے۔ سپاہی نے ان پر ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک اور

قیدی گھاس کاٹنے میں مصروف تھا۔ وہ شکل و صورت سے میری طرح جوان لگتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی چیتھڑے بنے ہوئے تھے۔ اس نے درانتی چلاتے ہوئے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر گھاس کاٹتے کاٹتے میرے اتنا قریب آ گیا کہ میں سوجی ہوئی آنکھوں سے اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔

اس نے منہ نیچے کر کے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم انڈین ہو؟"

میں نے منہ نیچے کر کے جواب دیا۔

"نہیں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

اس نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ منہ نیچے کر لینے سے اونچی گھاس آگے آ جاتی تھی اور دور سے کسی سپاہی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ ہم بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کونسی جگہ ہے؟"

"یہ ڈیول آئی لینڈ ہے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ میں اس جہنمی ڈیول آئی لینڈ میں پہنچایا گیا ہوں جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جس قیدی کو ایک بار وہاں لے جایا جاتا ہے پھر اس کی لاش بھی وہاں سے باہر نہیں جاتی۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ سمجھ گیا کہ اب کوئی معجزہ ہی مجھے وہاں سے نکال سکتا ہے۔ میں آہستہ آہستہ درانتی چلاتے ہوئے گھاس کاٹنے لگا۔ تھوڑی سی گھاس جمع ہو جاتی تو اسے اٹھا کر ایک جگہ ڈھیری میں پھینک دیتا۔

میں نے منہ اونچا کر کے سامنے دیکھا۔ ہمارا پہرے دار سپاہی مجھ سے کافی دور تھا۔ میں نے نوجوان سے پوچھا۔

"تمہیں کس جرم میں یہاں لایا گیا ہے؟"

اس نے درانتی چلاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میں نے پیرس کے ایک رسالے میں ڈیول آئی لینڈ کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں حکومت پر تنقید کی گئی تھی۔ میں ادیب ہوں اور کہانیاں بھی لکھتا ہوں۔ میرا نام کرسٹوف ہے۔"

پہرے دار دور سے چلتا ہوا ہماری طرف آیا۔ کرسٹوف دور ہٹ گیا۔ پہرے دار نے آتے ہی اس غریب پر ہنٹر چلانے شروع کر دیئے۔ کرسٹوف بری طرح بلبلانے لگا۔

دوپہر کے وقت ہم سب قیدیوں کو ایک طرف جانوروں کی طرح بٹھا دیا گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ٹین کے ڈبے تھما دیئے گئے۔ دو آدمی سبزیوں کے سوپ کا تھیلا اور سیاہ رنگ کی ڈبل روٹی ٹکڑوں سے بھری ہوئی ٹوکری لے کر وہاں آ گئے۔ ہر قیدی کے ڈبے میں سوپ کا ایک ڈونگا الٹ دیا جاتا۔ ایک ایک کالی سوکھی ہوئی ڈبل روٹی جھولی میں پھینک دی جاتی۔ میں نے دانتوں سے اٹھا کر ڈبل روٹی کو توڑنا چاہا۔ ڈبل روٹی نے ٹوٹنے سے انکار کر دیا۔

رات کو ہمیں ایک الگ الگ بوسیدہ جھونپڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں تاکہ ہم بھاگ نہ سکیں۔ رات کو مچھروں نے حملہ کر دیا۔ ساری رات مچھروں سے مقابلہ کرتے رہے۔ دوسرے دن جھونپڑیوں سے نکال کر ہماری بیڑیاں اتاری گئیں۔ اور ہمیں پہرے داروں کی نگرانی میں کام پر لگا دیا گیا۔ اسی روز شام کو جب جنگل میں جگہ جگہ مشعلیں روشن ہو گئیں تھیں، ہم نئے قیدیوں کو ایک بانس کی چھت والے بڑے جھونپڑے میں اکٹھا کیا گیا۔ ہمیں زمین پر بٹھا دیا گیا۔ اس کی جھونپڑے کی صرف چھت تھی۔ دیواروں کی جگہ بانس لگے ہوئے تھے۔ وہی بھولے ہوئے گالوں والا وارڈن اپنے باڈی گارڈز کی حفاظت میں وہاں پہنچ گیا۔ اس کے لئے میز کرسی پہلے سے لگا دی گئی تھی۔ گیس کا ایک لیمپ روشن کر کے بانس کے

میز کرسی پہلے سے لگادی گئی تھی۔ گیس کا ایک لیمپ روشن کر کے بانس کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔

وارڈن نے زور سے میز پر اپنا ہنٹر مارا۔ سب قیدی بے جان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

"کچھ نئے حرامی قیدی ایسے بھی آئے ہیں جو حرامی امریکی ہیں۔ وہ ہسپانوی اور ہماری فرنچ زبان نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان حرامیوں کے لئے میرا آدمی انگریزی میں ترجمہ کرتا جائے گا۔"

وہ ہسپانوی میں بولتا جاتا اور قریب کھڑا آدمی اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتا جاتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم ڈیول آئی لینڈ کے عمر قیدی ہو۔ اس آئی لینڈ کے اردگرد دنیا کا سب سے خطرناک سمندر ہے جس میں آدم خور شارک مچھلیاں چوبیس گھنٹے شکار کی تلاش میں پھرتی ہیں۔ آج تک یہاں سے کوئی قیدی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوا۔ جس نے فرار ہونے کی کوشش کی وہ آدم خور شارک مچھلیوں کا لقمہ بن گیا۔ اب تمہیں ساری زندگی، جتنی دیر تک تم ہمت کر سکتے ہو، اسی خونی جزیرے میں گزارنی ہوگی۔ جزیرے کے اس طرف مرد قیدی ہیں۔ جزیرے کے دوسری طرف قیدی عورتیں ہیں۔ کسی قیدی کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں۔ ہم نے درمیان میں خاردار تار لگادی ہے۔ اگر کوئی قیدی اس طرف جاتا دکھائی دیا تو ادھر ہی بھون دیا جائے گا۔ میرا نام رچرڈ ہے۔ میں ڈسپلن کا سخت پابند ہوں۔۔۔۔"

اس کی تقریر اور تقریر کا ترجمہ جاری تھا کہ ایک قیدی کی جو شامت آئی تو اس نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ شاید وہ کچھ پوچھا چاہتا تھا۔ وارڈن رچرڈ کو اس کا ہاتھ کھڑا کر کے

تقریر کو روکنا سخت ناگوار گذرا۔ اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اٹھ کر پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

قیدی پکی عمر کا تھا۔ اسکے بال سفید ہو رہے تھے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

"سر! مجھے ڈیول آئی لینڈ میں رہتے ہوئے اور بغیر مقدمہ چلائے تیس برس گزر گئے ہیں۔ مجھے بتایا جائے میں کب رہا ہوں گا؟۔"

وارڈن رچرڈ کے تاثرات گرگٹ کی طرح بدلنے لگے۔ اس کے لال لال گال اور زیادہ پھول گئے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے ضبط کر کے اشارے سے بدنصیب قیدی کو اپنے پاس بلایا۔ قیدی چیتھڑے لٹکائے لڑکھڑا کر چلتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ اس قیدی کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ سنگدل شیطان صفت وارڈن نے بڑی نرم آواز میں قیدی سے پوچھا۔

"کیا تم یہاں سے رہائی چاہتے ہو؟۔"

بے چارے قیدی میں اب بولنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس نے ایسے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو، ہاں میں اس جہنم سے نجات چاہتا ہوں۔

وارڈن نے چشم زدن میں ہولسٹر میں سے پستول نکالا اور اسکی نالی بدنصیب قیدی کی طرف کر کے فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور قیدی اچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔

سب قیدی دم بخود ہو کر رہ گئے۔ وارڈن رچرڈ پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر چلایا۔

"تم میں سے اور کون ہے جو ڈیول آئی لینڈ سے رہائی چاہتا ہے؟"

قیدیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دہشت اور خوف کے مارے سب اپنی جگہ پتھر بن گئے تھے۔ وارڈن رچرڈ نے یہ کہہ کر پستول اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا۔

"خبردار! آئندہ جب میں بول رہا ہوں تو کسی کو مجھے ٹوکنے کی جرات نہ ہو۔"

اس کے بعد اس نے اپنی تقریر جہاں سے چھوڑی تھی وہیں سے دوبارا شروع کر دی۔ دو سپاہی بدنصیب قیدی کی لاش کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ظالم وارڈن نے کچھ دیر تقریر کی۔ قیدیوں کو فرار کے خوفناک نتائج سے آگاہ کیا اور اسکے بعد قیدی پہرے داروں کی نگرانی میں اپنے اپنے بوسیدہ جھونپڑوں میں بند کر دیئے گئے۔

جب اس جہنم میں رہتے ہوئے ایک اندازے کے مطابق مجھے مہینہ گزر گیا اور میری آنکھوں کی سوجن اور جسم کا درد بھی جاتا رہا تو میں نے وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ پیرس کا ادیب کرسٹوف میرا دوست بن گیا تھا۔ مشقت کے دوران ہم ایک دوسرے سے بات چیت نہ کر سکتے تھے۔ شام کے وقت ہم جب روکھی سوکھی کھا کر جھونپڑے کے باہر بیٹھتے تو اس وقت قیدیوں کو اجازت تھی کہ وہ کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے تھے۔ لیکن پہرے دار چل پھر کر پہرہ دیتا رہتا تھا۔ مجھے اپنی دوست فلورا کی بھی فکر تھی جس سے مجھے واقعی محبت ہو گئی تھی۔ اسکا ابھی تک صرف اتنا ہی سراغ ملا تھا کہ وہ ڈیول آئی لینڈ کی دوسری جانب خاردار تاروں کے پاس قیدی عورتوں کے جھونپڑوں میں موجود ہے۔ ابھی تک میں نے اس کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ مرد قیدیوں کو اس حصے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دن کے وقت ادھر نظر پڑتی تو عورتیں مشقت کرتی نظر آجاتیں تھیں۔ مگر ان میں مجھے فلورا کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ عورتوں کو بھی خاردار تار کے پاس آنے کی اجازت نہیں تھی۔

میرے دوست کرسٹوف کو فلورا کے بارے میں میں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسے میں نے اپنی پوری داستان سچ سچ سنا دی تھی۔ جب میں نے ایک شام کو اسے بتایا کہ میں فلورا کو ساتھ لے کر یہاں سے فرار ہونا چاہتا ہوں تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"یہاں سے فرار تقریباً ناممکن ہے۔ چاروں طرف سے آئی لینڈ سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ سمندر میں خونخوار شارک مچھلیاں ہیں جنہیں انسانی گوشت پر پالا گیا ہے۔ جانتے ہو جو قیدی مرجاتا ہے اسے سمندر میں سارک مچھلیوں کے آگے ڈال دیا جاتا ہے۔ تم یہاں سے فرار کیسے ہو سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں ساری زندگی اسی جہنمی جزیرے پر بسر نہیں کر سکتا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ جب میں فاقوں اور بیماریوں سے مرجاؤں تو مجھے اٹھا کر شارکوں کے آگے ڈال دیا جائے۔ میں فلورا کا بھی یہ انجام نہیں دیکھ سکتا۔ میں یہاں سے فرار ہونے کا خطرہ مول لے کر رہوں گا۔ اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نا ایک بار یہاں سے فرار ہونے کی ایک کوشش کی جائے۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

کرسٹوف سوچ میں پڑ گیا۔

"میں کل شام تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ مجھے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہیے۔"

دوسرے دن شام کو ہم جھونپڑے کے باہر آگ جلا کر بیٹھ گئے۔ میں نے کرسٹوف سے پوچھا کہ اس نے کیا سوچا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارا خیال صحیح ہے۔ موت تو ہر حالت میں ہمارے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ لیکن ہمیں فرار ہونے کی ایک کوشش ضرور کر لینی چاہیے۔ اگر ہم نے عقل مندی اور منصوبہ بندی سے کام لیا تو ہم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔"

مجھے امید بندھ گئی۔ میں نے کرسٹوف سے کہا۔

"تم کافی دیر سے یہاں ہو۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ خیال رکھنا کہ میں فلورا کو بھی ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔"

کرسٹوف خاموش نگاہوں سے الاؤ کی بجھتی ہوئی آگ کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کام بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی قیدی عورتوں کی جیل کی طرف نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا۔

"اسی لئے تو میں تم سے مشورہ لے رہا ہوں۔ اگر یہ کام مشکل نہ ہوتا تو میں اب تک اپنی گرل فرینڈ کو لے کر یہاں سے بھاگ چکا ہوتا۔ تم مجھے کوئی ترکیب بتاؤ ہم ان حالات میں کیا کر سکتے ہیں۔"

کرسٹوف دانشور ٹائپ کا نوجوان تھا مگر اسکے اندر زندہ رہنے کا اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا بھرپور جذبہ موجود تھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"جزیرے پر ہفتے میں ایک بار ایک سٹیمر راشن کی سپلائی اور دوسرا ساز و سامان لے کر آتا ہے۔ لیکن مہینے میں ایک بار یہی سٹیمر یہاں کے عملے کے لئے رم کی شراب لے کر آتا ہے۔ یہ شراب لکڑی کے بڑے بڑے گول ڈرموں میں بند ہوتی ہے۔ جزیرے پر آکر اس شراب کو ایک بہت بڑے ٹینک میں ڈال کر ڈرم خالی کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ چھ سات ڈرم ہی ہوتے ہیں۔ یہ خالی ڈرم ہمارے جھونپڑوں کے پیچھے جو چھوٹا خالی گھاٹ ہے وہاں پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ سٹیمر یہاں دو دن ٹھہرتا ہے۔ تیسرے دن یہ خالی ڈرم سٹیمر پر رکھ دیئے جاتے ہیں اور وہ انہیں لے کر واپس گیانا کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ میں نے اس کا بڑے غور سے مشاہدہ کیا ہے۔ اسکی وجہ یہ

ہے کہ ایک بار میں نے یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا تو میرا خیال ان خالی ڈرموں کی طرف ہی گیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔

"خالی ڈرموں کی طرف ہی تمہارا خیال کیوں گیا تھا؟"

کرسٹوف بولا۔

"اگر ہم کسی طرح ان خالی ڈرموں کے اندر چھپ کر بیٹھنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم ان کے ساتھ ہی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ یقین کرو۔ اس کے سوا یہاں سے نکلنے کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

مجھے کرسٹوف کی یہ تجویز اچھی لگی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"لیکن میری گرل فرینڈ فلورا کو ہم اس منصوبے سے کیسے آگاہ کریں گے اور یہ کیسے ممکن ہو گا کہ جس وقت ہم کسی طرح خالی ڈرموں تک پہنچ جائیں تو وہاں فلورا بھی موجود ہو؟"

کرسٹوف بڑا عقلمند لڑکا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس جہنمی جزیرے میں سیاسی قیدی بھی ہیں جنہیں فرانس کی برسراقتدار پارٹی نے محض نظریاتی اختلاف کی بناء پر ان کے بیوی بچوں سمیت اس جزیرے میں جلاوطن کر دیا ہے۔ انہیں مہینے میں ایک بار اپنے بیوی بچوں کو ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک رات بھی بیوی بچوں کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ اس ملاقات کے لئے دس بارہ جھونپڑے اس گھاٹ کے قریب ہی بنائے گئے ہیں جہاں شراب کے خالی ڈرموں کو رکھا جاتا ہے۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا تو کرسٹوف نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مگر ان سیاسی قیدیوں کو اپنی بیویوں اور بچوں سے ملنے کے لئے وارڈن رچرڈ کو رشوت دینی پڑتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ سیاسی قیدی یہاں رشوت کا کیسے بندوبست کرتے ہیں۔؟"

کرسٹوف بولا۔

"یہ لوگ پیرس میں اپنے رشتے داروں یا دوستوں کو ایک ہنڈی یا خط لکھ دیتے ہیں کہ اتنی رقم فلاں آدمی کو دے دی جائے۔ ان کے رشتے داروں اور دوستوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم ڈیول آئی لینڈ کے وارڈن رچرڈ کو بطور رشوت ادا کی جارہی ہے جس کے عوض ان کے عزیز یا رشتے دار قیدی کو اپنی بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت مل جائے گی۔ چنانچہ وہ یہ رقم وارڈن رچرڈ کے آدمی کو خفیہ طور پر ادا کر دیتے ہیں۔ جب یہ آدمی رقم لے کر وارڈن کے پاس پہنچ جاتا ہے تو سیاسی قیدیوں کی ان کے بیوی بچوں سے ہر ماہ کی خاص تاریخ کو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ رشوت کی یہ رقم ہر ماہ ادا کی جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"دوست مگر میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے اور پیرس میں میرا کوئی ایسا عزیز رشتے دار یا دوست بھی نہیں ہے جو میری خاطر چیف وارڈن رچرڈ کو یہ رقم ہر ماہ ادا کر سکے۔ تمہاری یہ تجویز تو میرے کسی کام نہیں آسکتی۔"

کرسٹوف خاموش ہو گیا۔ پہرے دار ٹہلتا ٹہلتا ہمارے پاس آکر رک گیا تھا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ پہرے دار کچھ دیر ہمیں گھورنے کے بعد آگے چل دیا۔ جب وہ کافی دور چلا گیا تو کرسٹوف نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اور فلورا کی ملاقات کے لئے میں رقم کا بندوبست بھی میں کر سکتا ہوں۔ اس میں صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھی مفاد ہے۔ میں پیرس میں اپنے ایک دوست کے نام خط لکھ کر چیف وارڈن کو دے دوں گا۔ اس کے لئے تمہیں فلورا کو اپنی بیوی ظاہر کرنا ہو گا۔ میرا دوست پیرس میں وارڈن کے آدمی کو مطلوبہ رقم ادا کر دے گا۔ اس کے بعد تم ساحل سمندر والے جھونپڑوں میں اپنی گرل فرینڈ کے پاس مہینے میں ایک رات گزار سکو گے۔"

ترکیب بہت اچھی تھی۔ مجھے فرار کی گرہیں کھلتی نظر آنے لگیں۔ میں نے کرسٹوف سے پوچھا کہ اس سلسلے میں مجھے چیف وارڈن سے ملاقات کرنی ہوگی۔ مگر وہ تو کسی قیدی سے نہیں ملتا۔ کرسٹوف نے کہا۔

"جب اسے معلوم ہو گا کہ تم اپنی بیوی سے ملاقات کے لئے اسے رشوت کی رقم ادا کرنے والے ہو تو وہ ضرور تمہیں اپنے آفس میں بلا لے گا۔ تم اسے کہنا کہ کرسٹوف میرا دوست میری طرف سے رشوت کی رقم کا انتظام کر رہا ہے۔ وہ مان جائے گا کیونکہ اسے رقم چاہیے۔"

کرسٹوف نے مجھے دوسری ساری تفصیلات بھی سمجھا دیں۔ چنانچہ میں نے ان پر عمل کرتے ہوئے دوسرے دن اپنے نگران سے مشقت کے بعد بڑی عاجزی سے کہا کہ میں اپنی بیوی سے ملاقات کے سلسلے میں چیف وارڈن سے ملنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو پہرے دار نے کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن جب میں نے اسے کہا کہ میں نے وارڈن صاحب کو رقم ادا کرنے کا سارا بندوبست کر لیا ہے تو اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کل تمہاری ملاقات کرا دوں گا۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس رقم میں نگران پہرے داروں کو بھی تھوڑا بہت حصہ ملتا ہے۔ دوسرے دن وہ مجھے وارڈن کے کمرے میں لے گیا۔ اس نے رچرڈ کو

پہلے سے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ سنگدل وارڈن نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور غصے میں پوچھا۔

"تمہارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ تم رقم کا کیسے انتظام کرو گے؟ کیا پیرس میں تمہارا کوئی دوست ہے؟ تم تو پاکستانی ہو۔"

میں نے اسے ساری بات بتاتے ہوئے کہا کہ کرسٹوف نام کا قیدی میرا ہمدرد ہے۔ اسے مجھ پر ترس آگیا ہے۔ میری بیوی فلورا بھی اسی جزیرے میں قید ہے میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میرے دوست نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وارڈن صاحب راضی ہو جائیں تو وہ پیرس میں اپنے دوست کے نام خط لکھ دے گا جہاں سے انہیں رقم مل جائے گی۔

"سر! کرسٹوف صرف ہم میاں بیوی پر ترس کھا کر ایسا کر رہا ہے۔ اس کے سوا اسکا کوئی مفاد نہیں ہے۔"

وارڈن کو ایک بہت بڑی رقم ملنے والی تھی۔ اس نے مجھے ایک طرف فرش پر بٹھا دیا اور سپاہی کو حکم دیا کہ قیدی کرسٹوف کو بلاؤ۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی کرسٹوف کو پکڑ کر لے آیا۔ وارڈن نے اس سے پوچھا۔

"پیرس میں تمہارا ایسا کوئی دوست یا رشتے دار ہے جو دس ہزار فرانک ادا کر سکے گا؟"

میں دس ہزار فرانک کا سن کر مایوس ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ مگر کرسٹوف نے کہا۔

"سر! پیرس میں میرا بڑا بھائی بزنس کرتا ہے۔ میں اس کے نام رقعہ لکھ دوں گا۔ وہ آپ کے آدمی کو اسی وقت دس ہزار فرانک ادا کر دے گا۔"

وارڈن کے چہرے پر بڑی کمینہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ رقعہ ابھی لکھ دو۔ اگر مطلوبہ رقم مجھے مل گئی تو میں تمہارے اس پاکستانی دوست کو اس کی بیوی فلورا سے ملاقات کی اجازت دے دوں گا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کرسٹوف کے آگے وارڈن نے قلم اور کاغذ رکھ دیا۔

"یہاں جو آدمی یہ رقعہ لے کر آئے اس کو دس ہزار فرانک کی نقد رقم ادا کر دی جائے۔"

کرسٹوف نے یہ عبارت لکھ کر نیچے دستخط کر دیئے۔

وارڈن رچرڈ نے کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت کو غور سے پڑھا اور اسے لفافے میں بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور گرج دار آواز میں بولا۔

"جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔ جس وقت رقم میرے پاس پہنچی، تمہارے پاکستانی دوست کو اسکی بیوی سے ملاقات کی اجازت دے دی جائے گی۔ مگر یاد رکھنا۔ یہ رقم جس مہینے مجھے نہ ملی اس مہینے ان میاں بیوی کی ملاقات نہیں کرائی جائے گی۔"

کرسٹوف اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ ملاقات صرف ایک ہی بار ہو گی۔ اس کے بعد تو ہم وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے اور ممکن ہے اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ کرسٹوف بولا۔

"سر! یہ رقم آپ کو ہر ماہ نہیں ادا کر سکوں گا۔ اتنا ضرور ہے کہ محض انسانی ہمدردی کے تحت میں چھ ماہ میں ایک بار یہ رقم برابر ادا کر دیا کروں گا تاکہ یہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے سال میں دو بار ہی ملاقات کر سکیں۔"

وارڈن نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تمہیں تو پادری ہونا چاہیے تھا۔ جاؤ اب میرے آفس سے دفع ہو جاؤ"

ہم واپس آکر اپنی اپنی مشقت میں لگ گئے۔ اس وقت ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کر سکتے تھے۔ شام کے وقت ہمیں جب معمول کے مطابق بیٹھنے اور باتیں کرنے کا وقت ملا تو میں نے کرسٹوف کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ بڑی بے باکی سے کہنے لگا۔

"دوست! تم کس بات کا شکریہ ادا کرتے ہو۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اس میں میرا مفاد بھی ہے۔ تمہارے ساتھ میں بھی اس جہنم سے فرار ہونا چاہتا ہوں۔ یہاں سے فرار ہونے کے لئے دس ہزار فرانک تو کیا میرا بھائی پچاس ہزار فرانک بھی ادا کر سکتا ہے۔ شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے کہ تمہاری وجہ سے مجھے فرار کا ایک سنہری موقع مل رہا ہے۔ کیونکہ اس طرح تو میں بھی تمہارے ساتھ جھٹی کے خالی ڈرموں تک پہنچ سکوں گا"

وقت گزرتا گیا۔ کوئی پندرہ بیس دن کے بعد ایک روز پہرے دار سپاہی نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا۔

"چلو۔ تمہیں وارڈن صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ وارڈن کے آفس میں چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ پیرس میں کرسٹوف کے بھائی نے مطلوبہ رقم ادا کر دی ہے۔ وارڈن رچرڈ اپنی شاندار کرسی پر کسی ڈکٹیٹر کی طرح بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ میں سلام کر کے ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

وارڈن نے میری طرف نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو۔ تمہارے دوست نے تم دونوں میاں بیوی کی ملاقات کے لئے جو رقم لکھی تھی وہ مجھے مل گئی ہے۔ اب تمہیں اجازت ہے کہ تم ایک رات اپنی بیوی کے ساتھ گزار سکتے ہو۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم نے کسی سے ذکر کیا کہ تم نے اس کے عوض کوئی رقم ادا کی ہے تو تم اور تمہاری بیوی دونوں کی لاشیں

لاشیں اگلے روز شارک مچھلیوں کے آگے ڈال دی جائیں گی۔ اپنے دوست کو بھی خبردار کر دینا۔"

میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"سر! آپ مطمئن رہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ آپ کی مہربانی سے مجھے اپنی بیوی سے ملنے کا موقع ملا ہے اور میں اس کا کسی سے ذکر کر کے اپنی اور اپنی بیوی کی موت کو آواز دوں گا۔ میں مر بھی جاؤں تو کسی کے آگے زبان نہیں کھولوں گا۔"

وارڈن مسکرایا۔

"تم بڑے چالاک نوجوان ہو۔ ٹھیک ہے اب بتاؤ تم کس رات اپنی بیوی کے پاس جانا چاہتے ہو۔ تمہاری بیوی کو اطلاع کر دی جائے گی۔"

میں نے سوچا کہ یہ ایک ہی ملاقات ہوگی۔ فلورا سے یہ قیمتی ملاقات کرنے سے پہلے ہمیں اپنے منصوبے کو آخری شکل دینا بڑا ضروری ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اسی رات ہمیں فلورا کو لے کر یہاں سے فرار ہونا پڑے۔ اس کے لئے دو تین دن کی مہلت بڑی ضروری تھی تاکہ کرسٹوف سے مل کر پورا منصوبہ بنا لیا جائے۔ میں نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"سر! کل سے میرے دانت میں درد ہو رہا ہے سر! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے ایک ہفتے کی مہلت دے دیں۔ تب تک میرے دانت کا درد ٹھیک ہو گیا ہو گا"

وارڈن نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آخر تم اتنی مدت کے بعد اپنی بیوی سے ملو گے تو تم اس کا منہ ضرور چومو گے اور دانت کے درد کے ساتھ تم ایسا نہ کر سکو گے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے ایک ہفتے بعد مل لینا۔ اب دفع ہو جاؤ"

میں نے جھک کر سلام کیا اور سپاہی مجھے آفس سے نکال کر وہیں لے آیا جہاں میں ایک درخت کی کٹائی میں مصروف تھا۔ میں نے درخت کی کٹائی شروع کر دی۔ کرسٹوف مجھ سے کافی دور تھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے آتے اور جاتے دیکھ لیا تھا مگر اس نے اشارہ تک نہ کیا۔ وہ بھی اپنے کام میں لگا رہا اور میں بھی اپنی مشقت میں مصروف رہا۔ کرسٹوف سے اس وقت کوئی اشارہ کرکے بھی میں کسی کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

شام کو جب مشقت کے بعد ہمیں جھونپڑے کے باہر بیٹھنے کا موقع ملا تو میں نے بتایا کہ وارڈن نے دس ہزار فرانک وصول کر لئے ہیں اور اب اس نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں جس رات چاہوں فلورا سے مل سکتا ہوں۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں نے دانت کے درد کا بہانہ بنا کر اس سے تین چار دن کی مہلت لے لی ہے تاکہ اس دوران ہم فرار کے منصوبے کو آخری شکل دے سکیں۔ کرسٹوف نے پہرے دار کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے قریب آ رہا تھا۔ وہ قریب آکر ایک لمحے کے لئے ٹھہرا۔ پھر آگے چل دیا۔ کرسٹوف کہنے لگا۔

"مجھے معلوم تھا میرا بھائی یہ رقم ادا کر دے گا۔ بات یہ ہے کہ تمہاری مدد کے بغیر مجھے یہاں سے فرار کا موقع نہیں مل سکتا تھا کیونکہ وارڈن کو اگر میں دس لاکھ ڈالر بھی دے دوں تو وہ مجھے یہاں سے فرار ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔ کیونکہ ڈیول آئی لینڈ میں فرانس کی حکومت کا قانون بے حد سخت ہے۔ اگر کوئی قیدی یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہاں کے وارڈن کو عمر قید کی سزا ملتی ہے۔ بلکہ حکومت اپنے آدمیوں سے اسے مروا بھی دیتی ہے اس لئے کوئی بھی وارڈن ایسی حرکت کبھی نہیں کرتا۔ وہ رشوت لے کر قیدیوں کو تھوڑی بہت سہولت ضرور فراہم کر دیتا ہے اور

اسکی حکومت کو بھی خبر ہوتی ہے مگر وہ کچھ نہیں کہتی۔ تمہاری وجہ سے اب میں بھی یہاں سے فرار کی کوشش کر سکتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "تم یہاں کافی دیر سے رہ رہے ہو اب بتاؤ کہ ہم اپنی سکیم پر کس طرح عمل کریں گے۔ کیونکہ فلورا سے ملاقات کے وقت ہماری ساری سکیم بالکل تیار ہونی چاہیے۔ بلکہ اسی رات ہمیں یہاں سے فرار بھی ہو جانا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلورا سے دوسری ملاقات میں کافی وقت اور پیسہ بھی خرچ ہو گا۔"

کرسٹوف نے الاؤ کی آگ کو کریدتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس دوران ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم اکیلے یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔ یہاں کے ایک آدمی کی مدد بڑی ضروری ہے اور میں نے اسے بھی کچھ رقم دے کر جو میں نے یہاں کسی طرح جمع کر رکھی تھی راضی کر لیا ہے۔ یہ آدمی اسی طرف رات کو پہرہ دیتا ہے جدھر شراب کے خالی ڈرم پڑے ہوتے ہیں۔ یہ آدمی ہماری صرف اتنی مدد کرے گا کہ جب ہم جیٹی کی طرف جائیں تو وہ ہمیں دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لے گا۔ آگے سب کچھ ہمیں ہی کرنا ہو گا اور تمام خطروں کا مقابلہ خود ہی کرنا ہو گا۔"

"شراب کے یہ خالی ڈرم وہاں کتنی دیر تک پڑے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کیونکہ ہم بھوکے پیاسے ان ڈرموں میں زیادہ دیر تک بند نہیں رہ سکتے"

کرسٹوف بولا۔

"یہ بھی میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ اس مہینے کی سپلائی میں شراب کے جو ڈرم آئے وہ ایک ہفتے سے جیٹی پر پڑے ہیں اور تین دن بعد انہیں بڑے سٹیمر میں لاد کر واپس گیانا لے جایا جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"اسکا مطلب ہے کہ ہمارے پاس صرف دو دن اور دو راتیں ہیں؟"

"ہاں" کرسٹوف بولا۔ "اس حساب سے ہمیں پرسوں رات کو فلورا سے ملاقات کرنی ہوگی۔ تم اسے ساری بات سمجھا دو گے۔ جیٹی عورتوں کی جھونپڑی کے پیچھے کوئی پانچ سو گز کے فاصلے پر کھاڑی کے کنارے ہے۔ وہاں رات کو صرف ایک ہی پہرے دار ہوتا ہے جس کو رشوت دے کر میں نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اس کام پر وہ اس لئے راضی ہو گیا ہے کہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم خالی ڈرموں میں چھپ کر فرار نہیں ہوں گے بلکہ کھاڑی کے سمندر میں چھلانگیں لگا کر کسی دوسرے جزیرے پر جانے کی کوشش کریں گے اور اسے یقین ہے کہ ہم شارک مچھلیوں کا شکار ہو جائیں گے اور اس پر کوئی الزام نہیں آئے گا کہ ادھر سے کوئی قیدی بھاگا تھا کیونکہ آگے کھلا سمندر ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"ہمیں کیا کیا چیزیں اپنے ساتھ لے جانی ہوں گی۔ یہاں سے تو ہم بظاہر کچھ بھی نہیں لے جا سکتے۔"

کرسٹوف کہنے لگا۔

"ہمیں سب سے زیادہ ضرورت پانی کی ہوگی۔ پلاسٹک کی بوتلیں یہاں عام گری پڑی ہوتی ہیں۔ ہم پلاسٹک کی چار بوتلوں میں پانی بھر کر اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔ ہم ڈبل روٹی بھی کچھ بچا کر اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ ڈیول آئی لینڈ سے گیانا کی بندرگاہ کا سفر ان لوگوں کے بڑے سٹیمر پر ایک دن کا ہے۔ ایک بار ہمارے ڈرم جہاز پر لاد دیئے گئے اور سٹیمر چل پڑا تو ہم ایک دن میں گیانا پہنچ جائیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خالی ڈرم یہاں سے لے جا کر جزیرے کی بڑی جیٹی پر کچھ دیر پڑے رہیں۔ وہ وقت ہمارے لئے

سخت مشکل اور مصیبت کا ہو گا کیونکہ خالی ڈرموں میں ہم زیادہ حرکت نہیں کر سکیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے یہاں سے خالی ڈرم چھوٹے سٹیمر میں اسی وقت لاد دیئے جاتے ہیں جب بڑی جیٹی پر گیانا جانے والا بڑا سٹیمر چلنے والا ہوتا ہے۔"

"کیا یہ ڈرم بند ہوتے ہیں؟ میرا مطلب ہے ان میں شراب نکالنے کے بعد ان کے ڈھکن بند کر دیئے جاتے ہیں؟ اور ان میں سے ہوا آنے کا کیا انتظام ہو گا۔ کہیں ہم دم گھٹنے سے مر ہی نہ جائیں۔"

کرسٹوف نے کہا۔

"شراب نکالنے کے بعد ان ڈرموں کے ڈھکن ضرور بند کر دیئے جاتے ہیں مگر ان میں جو کیل ٹھونکے جاتے ہیں وہ پورے نہیں ٹھونکے جاتے کیونکہ گیانا پہنچنے کے بعد ان میں دوبارہ شراب بھرنے کے لیے انہیں کھولنا ہوتا ہے۔ ہم ان ادھ ٹھکے ہوئے کیلوں کو لوہے کی پتری سے کھول لیں گے۔ ہم لوہے کی ایک پتری ساتھ لے کر جائیں گے۔"

میں نے سوال کیا۔

"گیانا پہنچنے کے بعد کیا صورت حال ہوگی؟ کہیں ہم وہاں تو نہیں پکڑے جائیں گے؟"

کرسٹوف بولا۔

"یہ اب ہماری قسمت ہے۔ آگے کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ خالی ڈرم یہاں سے لے جا کر کہاں رکھے جاتے ہیں۔ جہاں تک ڈرموں میں تازہ ہوا آنے کا معاملہ ہے تو ان ڈرموں میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس کو شراب بھرنے کے بعد لکڑی کے ڈاٹ سے بند کر دیا جاتا ہے۔ لیکن شراب نکالنے کے بعد یہ ڈاٹ کھلا رکھا جاتا ہے تاکہ ڈرم میں ہوا پھرتی رہے اور کسی قسم کی بو پیدا نہ ہو۔ یہ میں نے معلوم کر لیا ہوا ہے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں نے ایک بار ان خالی ڈرموں میں چھپ کر فرار

ہونے کا منصوبہ بنایا تھا مگر اس پر عمل نہ کر سکا۔ یہ ساری معلومات میں نے انہی دنوں حاصل کی تھیں۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر اسکا مطلب ہے پرسوں رات ہم یہاں سے فرار ہو رہے ہیں؟"

"پروگرام تو یہی ہے۔ آگے جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہو کر رہے گا۔ تم ایسا کرو۔ کل وارڈن سے جاکر ملو اور اسے کہو کہ تمہارے دانت کا درد ٹھیک ہو گیا ہے اور تم اگلی رات فلورا کے ساتھ اس کے جھونپڑے میں گزارنا چاہتے ہو۔ اس کے بعد آگے سوچیں گے۔"

میں نے کہا۔

"کرسٹوف! ہمیں جو کچھ سوچنا ہے ابھی سوچنا ہے۔ کیونکہ ایک بار وارڈن سے اجازت مل گئی تو پھر ہم اسے ملتوی نہیں کر سکیں گے۔ پھر ہمیں ہر حالت میں یہاں سے پرسوں رات فرار ہونا پڑے گا۔"

کرسٹوف نے اپنے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میری اطلاع کے مطابق یہ ڈرم پرسوں رات کے پچھلے پہر جیٹی سے لے جاکر بڑی جیٹی پر کھڑے جہاز پر لاد دیئے جائیں گے اور جہاز سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ بڑا جہاز ہمیشہ سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہوتا ہے اور رات کے پچھلے پہر کو گیانا کی بندرگاہ پر پہنچ جاتا ہے۔"

"کیا یہ بندرگاہ خاص گیانا شہر کی بندرگاہ ہو گی؟" میرے اس سوال پر کرسٹوف نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ گیانا شہر کی بندرگاہ وہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ سنا ہے کہ جہاز دارالحکومت سے کچھ فاصلے پر ایک جزیرے پر جاکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر اس جزیرے

پر کوئی جیل وغیرہ نہیں ہے اور وہاں آزاد شہری رہتے ہیں۔ یوں ہمیں وہاں سے نکل جانے کا آسانی سے موقع ملے گا۔ باقی اس قسم کے خطرات ہمیں مول لینے پڑیں گے۔ یہاں سے فرار ہونا اتنا آسان نہیں کہ ٹکٹ لیا اور جہاز میں سوار ہو کر فرنچ گیانا پہنچ گئے۔"

"کیا ہمیں فرنچ گیانا انہیں پھٹے پرانے کپڑوں میں ہی فرار ہونا ہو گا؟"

"ہمارے پاس دوسرے کپڑے نہیں ہیں اس لئے انہیں کپڑوں میں فرار ہونا ہو گا۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے کہ یہاں قیدیوں کی کوئی وردی نہیں ہے۔ یہی ایک پتلون اور قمیض ہے جو مہینے دو مہینے بعد نئی مل جاتی ہے۔ اگر یہاں کی کوئی خاص وردی ہوتی تو گیانا کی بندرگاہ پر پہنچنے کے بعد ہم آسانی سے پکڑے جا سکتے تھے۔"

جب کرسٹوف کے ساتھ سارا معاملہ طے ہو گیا تو میں دوسرے دن پہرے دار کے ساتھ چیف وارڈن کے دفتر میں گیا اور اسے کہا۔

"سر! میرے دانت کا درد ٹھیک ہو گیا ہے' برائے مہربانی مجھے کل رات اپنی بیوی سے ملاقات کی اجازت عنایت کیجئے۔ آپ کی بڑی نوازش ہو گی۔"

وارڈن رچرڈ زور سے ہنس پڑا۔

"حرامی! اپنی بیوی کا منہ چومنے کو کتنے بے تاب ہو رہے ہو۔ ارے اب تمہاری بیوی کے بوسوں میں کیا رکھا ہے۔ نہ جانے کتنے آدمیوں نے اسے بھنبھوڑا ہو گا۔ بہرحال مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ کل شام سورج غروب ہونے کے بعد یہاں آنا۔ اب دفع ہو جاؤ۔۔۔۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے گالی دی اور سگار پینے لگا۔ میں اسے ادب سے سلام کر کے واپس آ گیا۔

شام کو میں نے کرسٹوف کو بتایا کہ کل رات کی ملاقات طے ہوگئی ہے۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"بڑی اچھی بات ہے۔ اب میں تمہیں عورتوں کے جھونپڑوں کا نقشہ بنا کر بتاتا ہوں کہ تمہیں فلورا کو لے کر کس طرف سے کھاڑی کے سمندر کی طرف نکلنا ہوگا۔"

اس نے الاؤ کی روشنی میں زمین پر دو چار لکیریں بنائیں اور ایک جگہ انگلی رکھ کر کہنے لگا۔

"یہ عورتوں کی جھونپڑیاں ہیں۔ میں ایک بار ادھر کا چکر لگا چکا ہوں۔ ایک دفعہ مرد قیدیوں کو مشقت کے لئے ادھر لے جایا گیا تھا۔ ان جھونپڑوں کے عقب میں جنگلی کیلوں کے درختوں کی دیوار بنی ہوئی ہے۔ تم فلورا کو لے کر ان درختوں کی طرف جاؤ گے۔ یہاں کوئی خاردار تار نہیں لگی ہوئی۔ کیونکہ یہ ساری جگہ قیدی جزیرے کی جیل کے اندر ہی آتی ہے۔ کیلے کے درختوں کے پیچھے تم آؤ گے تو تمہیں اپنی بائیں جانب کھاڑی کی چھوٹی سی جیٹی نظر آئے گی۔ تمہیں یہ سب رات کے اندھیرے میں معلوم کرنا ہوگا۔ اس جیٹی کا ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم ہے۔ وہاں پر تمہیں ایک طرف خالی ڈرم پڑے ہوئے ملیں گے۔ میں پہلے سے وہاں موجود ہوں گا۔"

میں نے کرسٹوف سے پوچھا۔

"تم کس طرح وہاں پہنچ جاؤ گے؟"

وہ بولا۔

"جس آدمی کو میں نے بھاری رشوت دی ہے وہ میری مدد کرے گا۔ وہی وہاں رات کو پہرہ دیتا ہے۔ میں اس کی مدد سے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمیں خالی ڈرموں میں گھستا ہوا دیکھ لے۔ پھر تو وہ ہمیں پکڑ کر واپس کر دے گا۔ کیونکہ یہ خطرہ وہ کبھی نہیں لے سکتا کہ اسکی موجودگی میں تین قیدی اس کی نگرانی میں پڑے ہوئے ڈرموں میں بند ہو کر وہاں سے فرار ہو جائیں۔"

کرسٹوف بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ رات اندھیری ہوگی ہم اسے دکھائی نہیں دیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے سمندر میں چھلانگیں لگا کر فرار ہونے کی کوشش کا پروگرام بنایا ہے۔ چنانچہ اس کو دھوکا دینے کے لئے ہم وہاں سے دو چار بھاری پتھر اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے جس کی آواز سے وہ سمجھ جائے گا کہ ہم سمندر میں کود گئے ہیں۔ پروگرام تو ہمارا یہی ہے۔ ہم نے ہر نکتے پر غور کر لیا ہے اور اب ویسا ہی کریں گے۔ لیکن آگے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہنا ہوگا۔"

وہ زمین پر کھینچی ہوئی لکیروں پر جگہ جگہ انگلی لگا کر مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنے میں پہرے دار کو قریب آتے دیکھ کر کرسٹوف نے انگلی اٹھالی اور ہم الاؤ میں آگ کریدتے ہوئے ہنس ہنس کر دوسری باتیں کرنے لگے۔ پہرے دار معمول کے مطابق ہمارے قریب سے ہو کر آگے گزر گیا۔ ہماری طرح دوسری جھونپڑیوں کے کچھ قیدی بھی آگ جلا کر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رات کو جزیرے میں خنکی ہو جاتی تھی۔ آگ جلانے سے مچھر بھی رات کو جھونپڑیوں میں نہیں آتے تھے۔

جب پہرے دار دور چلا گیا تو کرسٹوف نے کہا۔

"ہمارے پاس خنجر چاقو کا ہونا بہت ضروری تھا مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ بہرحال میں اپنے ساتھ پانی کی چند بوتلیں بھر کر اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے جیبوں میں ڈال کر ضرور لیتا آؤں گا۔"

میں فرار کے منصوبے پر مزید غور کرنے لگا۔ کرسٹوف بھی چپ ہو گیا۔ پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اگر فلورا تمہارے ساتھ جانے پر کسی وجہ سے تیار نہ ہوئی تو اسے مجبور مت کرنا۔ تم اسے چھوڑ کر کھاڑی پر پہنچ جانا اور فلورا کو تاکید کر کے آنا کہ وہ کسی کو تمہارے فرار کی کوئی بات نہ بتائے۔"

میں نے کہا۔

"فلورا کبھی انکار نہیں کرے گی۔ وہ تو خوشی خوشی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے گی۔ اسکا مجھے یقین ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر کل شام کو وارڈن کے پاس پہنچ جاؤ۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ کل جانے سے پہلے ہماری ایک مختصر سی ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ اب میں سونے جاتا ہوں۔"

کرسٹوف اپنے جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔ میں بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھ سوچنے لگا کہ کیا ہماری سکیم کامیاب ہو سکے گی؟"

جس رات مجھے فلورا سے ملنا تھا اور اس جہنمی جزیرے سے فرار ہونا تھا' اس کی شام کو سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے مشقت کے دوران میں گھاس پھونس صاف کرتا ہوا کرسٹوف کے ذرا قریب چلا گیا اور آہستہ سے کہا:۔ 'کیا سب ٹھیک ہے؟"

پہرے دار ہم سے دور تھے۔ ان کا دھیان بھی دوسری طرف تھا۔ کرسٹوف نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ آج رات دو بجے میں کھاڑی کی جیٹی پر خالی ڈرموں کے پاس بیٹھا ہوا تمہیں ملوں گا۔ میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے' اسی طرح کرنا۔ کیلے کے درختوں کی دیوار۔ اس کے پیچھے کھاڑی اور خالی ڈرموں والی جیٹی۔ اب خدا حافظ۔ رات کو ملیں گے۔"

کرسٹوف زمین پر پھاوڑا چلانے لگا۔ میں بھی دوسری طرف منہ کر کے گھاس پھونس کاٹنے لگ گیا۔ اس شام میری اور کرسٹوف کی معمول کے مطابق جھونپڑی کے باہر الاؤ کے پاس ملاقات نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ مجھے وارڈن کے پاس جانا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا' جب میں نے پہرے دار نگران سے کہا۔

"سر! مجھے وارڈن صاحب نے بلایا ہوا ہے۔ مجھے ان کے پاس لے چلیں۔"

اس نے غصے میں کہا:۔

"مجھے معلوم ہے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا۔ ابھی کام کرو۔"

میں اپنے کام پر لگ گیا۔ کچھ دیر بعد پہرے دار نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا۔ پھر مجھے اشارے سے بلایا۔

"چلو حرامی۔ تمہاری ملاقات کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے دل میں اسے زبردست گالی دی اور اوپر سے بڑے ادب سے کہا:۔"یس سر!"

وارڈن اپنے کمرے میں کرسی میں دھنسا سگار پی رہا تھا۔ سامنے میز پر شراب کی بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی قہقہہ لگا کر مجھے گالیاں دینے لگا۔

میں ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وارڈن کہنے لگا:۔"آج تم بیوی کے پاس رات گزارو گے۔ تمہاری بیوی کا جسم بڑا اچھا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ تم آج کی رات گزار آؤ' کل وہ میرے پاس آ رہی ہے۔"

اور وارڈن مکروہ انداز میں ہنسنے لگا۔ مجھے اس پر سخت غصہ آ رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا۔

"حرامی! کل میں اور فلورا یہاں نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا:۔"تھینک یو سر!"

وارڈن نے کہا:۔"حرامی! دو بوسے فلورا کے میری طرف سے بھی لینا۔ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ"

اس نے پہریدار سپاہی کو فرانسیسی میں کوئی حکم دیا۔ سپاہی نے مجھے بازو سے پکڑا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میری بیڑیاں اتار کر ایک طرف رکھ دی گئیں۔ پہریدار نے کہا۔

"کل صبح یہ بیڑیاں تمہیں پھر سے پہنا دی جائیں گی۔"

میں نے دل میں کہا۔ وہ صبح اب کبھی نہیں آئے گی۔ بیڑیاں اتروانے کے بعد پہریدار مجھے اس خاردار تار والی دیوار کی طرف لے کر چلا گیا جسکی دوسری جانب عورتوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ جھونپڑیوں کے باہر کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ قیدی عورتیں بھی مجھے نظر آئیں۔ پہریدار مجھے ساتھ لئے جھونپڑیوں کی قطار کے پاس لے کر آیا تو میں نے فلورا کو دیکھا۔ وہ پھٹے ہوئے لباس میں کھمبے کے ساتھ لگے ہوئے بلب کی روشنی میں جھونپڑی کے باہر کھڑی تھی۔ پہریدار نے مجھے اس کی طرف زور سے دھکیل دیا اور کہا:۔"صبح تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ تیار رہنا۔"

وہ چلا گیا۔ میں فلورا کی طرف بڑھا۔ وہ مجھ سے پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ گئے۔ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہم ایک دوسرے سے لگ کر یوں کھڑے تھے جیسے ہزاروں سال بعد مل رہے ہوں۔ فلورا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:۔"اندر آ جاؤ۔"

ہم جھونپڑی میں چلے آئے۔ جھونپڑی میں پانی کا ایک مٹکا ایک کٹورا رکھا ہوا تھا۔ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ فرش پر ہماری جھونپڑیوں کی طرح سوکھی گھاس کا فرش تھا۔ فلورا نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا۔

"سلمان! یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔ یہاں سے اب ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی۔ مجھے یہاں سے کسی طرح نکال کر لے جاؤ۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی"

وہ میرے سینے کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔ میں نے اس کے سر کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا:۔"حوصلہ رکھو فلورا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

فلورا کو وہاں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا کہ جن عورتوں کے خاوند اپنے بیوی بچوں کے پاس رات گزارنے کے لئے آتے ہیں' انہیں وارڈن کو بھاری رشوت ادا کرنی ہوتی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم نے وارڈن کو رشوت کہاں سے لاکر دی؟ ہمارے پاس جو قیمتی پتھر تھے' وہ تو کسٹم والوں نے لے لئے تھے۔"

میں نے کہا۔

"بس یوں سمجھو کہ قدرت کی طرف سے اسکا انتظام ہو گیا تھا۔"

فلورا نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ جھونپڑی میں یا جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں فلورا کی آنکھوں کے گرد حلقے زیادہ نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگی۔

"پلیز سلمان! مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکوں گی۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ یہ جگہ تو دنیا کا جہنم ہے۔"

میں نے اس کے کان کے قریب منہ لے جاکر دھیمی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں یہاں سے لے جانے کے لئے ہی آیا ہوں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"فلورا! یہ تمہاری اور میری اس جہنمی جزیرے میں آخری رات ہے۔"

فلورا مجھ سے چمٹ گئی۔

"میرے خدا! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

میں اسے الگ کر کے اٹھا۔ جھونپڑے کے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے واپس آکر فلورا سے کہا۔

"تم ایک بار جھونپڑے کے پیچھے جاکر دیکھو وہاں کوئی پہرے دار چھپ کر ہماری باتیں تو نہیں سن رہا۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر جھونپڑے سے باہر گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی۔ کہنے لگی۔

"میں دیکھ آئی ہوں۔ پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اب خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ کیا تم واقعی مجھے یہاں سے نکال کر لے جا رہے ہو؟"

میں نے اسے اپنے سامنے بٹھالیا اور شروع سے آخر تک ساری سکیم سناڈالی۔ وہ سن کر بے حد خوش ہوئی۔ پھر کچھ پریشان سی ہو کر کہنے لگی۔

"سلمان! کہیں راستے میں ہم پکڑے نہ جائیں۔ خالی ڈرموں میں میرا تو دم گھٹ جائے گا۔ لیکن ٹھیک ہے۔ یہاں سسک سسک کر مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں یہاں سے فرار ہوتے ہوئے مر جاؤں۔"

میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

"کرسٹوف نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ڈرم خالی ہوں گے۔ وہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان میں آسانی سے ایک آدمی لیٹ بھی سکتا ہے اور بیٹھ بھی سکتا ہے۔ پھر اس کے سوراخ میں سے تازہ ہوا آتی ہے۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں جھونپڑوں کے پیچھے پہرے وغیرہ کا کیا انتظام ہوتا ہے۔"

فلورا نے کہا۔

"یہاں رات کو دو ایک ہی پہرے دار ہوتے ہیں جو آدمی رات کے بعد اپنی اپنی پسند کی قیدی عورتوں کے جھونپڑوں میں گھس جاتے ہیں۔ اس طرح رات کے وقت یہ علاقہ پہرے داروں سے خالی ہو جاتا ہے۔"

فلورا نے بڑی حوصلہ افزا بات بتائی تھی۔ مجھے فرار ہونے کا راستہ صاف ہوتا نظر آنے لگا۔ اس نے پوچھا۔

"کھاڑی کی جیٹی پر تو ضرور پہرہ ہو گا' وہاں ہم پکڑے نہ جائیں؟"

میں نے اسے کہا۔

"وہاں صرف ایک چوکیدار رات کو گشت کرتا ہے۔ اسے کرسٹوف نے رشوت دے کر ساتھ ملا لیا ہے۔ وہ بھی اسی لئے راضی ہو گیا کہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم سمندر میں کود کر فرار ہوں گے۔ اس طرح وہ جانتا ہے کہ ہم زندہ نہ بچ سکیں گے اور اس پر بھی کوئی الزام نہیں آئے گا۔ کیونکہ ہماری لاشیں ہی نہیں ملیں گی۔ اسے یہ بالکل خبر نہیں ہے کہ ہم سمندر میں چھلانگیں لگانے کی بجائے جیٹی پر پڑے خالی ڈرموں میں گھس کر فرار ہونے والے ہیں۔"

فلورا نے پوچھا۔

"کہیں یہ خالی ڈرم وہیں پڑے نہ رہ جائیں۔ پھر تو ہمارا پکڑے جانا یقینی ہو گا۔"

میں نے اسے حوصلہ دیا۔

"تم خوامخواہ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ یہ خالی ڈرم آج رات کے پچھلے پہر وہاں سے اٹھا کر فرنچ گیانا جانے والے جہاز پر لاد دیئے جائیں گے اور جہاز سورج نکلنے سے پہلے سمندر میں روانہ ہو جائے گا اور یہ صرف بارہ تیرہ گھنٹے کا سمندری سفر ہو گا۔ ہم بارہ تیرہ گھنٹے خالی ڈرموں میں لیٹ کر گزار سکیں گے۔ ہمیں ہر حالت میں یہ تکلیف برداشت کرنی ہو گی۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ مجھے ابھی بتا دو۔ کیونکہ ہم تو اس منصوبے پر عمل کرنے ہی والے ہیں۔"

فلورا بولی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے یہاں سے نجات حاصل کرنے کا موقع ملے اور میں انکار کر دوں۔ اس جہنم سے تو میں کسی دشمن کے ساتھ بھی جا سکتی ہوں۔ تم تو میرے اپنے ہو۔"

میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بات یاد رکھنا۔ اگر خدا نہ کرے ہم پکڑے گئے تو ہماری موت یقینی ہے۔ ہمیں اس جزیرے کی آدم خور شارک مچھلیوں کے آگے ڈال دیا جائے گا۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے۔"

فلورا نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ سب کچھ منظور ہے۔ میں یہاں سے رہائی پانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم تیار ہو جاؤ۔ ہم آدھی رات کے بعد یہاں سے نکل چلیں گے۔"

"مجھے کیا تیار ہونا ہے۔ جو کپڑے پہنے ہوئے ہیں انہی میں نکل چلوں گی۔ میرے پاس تو جوتا تک نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہمارا بھی یہی حال ہے۔ تیار ہونے سے میرا مطلب تھا کہ ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔"

وقت معلوم کرنے کا ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وارڈن کے آفس کے باہر ایک لوہے کا گھنٹہ لگا ہوا تھا۔ وہ رات کے بارہ بجے ضرور بج اٹھتا ہے۔ دن کے وقت خاموش رہتا ہے۔ میں نے فلورا سے کہا۔

"جس وقت رات کے بارہ بجنے کا گھنٹہ بجے گا ہم اسی وقت یہاں سے نکل جائیں گے۔"

اس کے بعد ہم وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد فلورا دبے پاؤں جھونپڑے کے پیچھے جاکر دیکھ آتی تھی کہ وہاں کوئی پہرے دار چھپ کر ہماری باتیں تو نہیں سن رہا۔ یہ میں اسے بھیجتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

رات گزرتی چلی گئی۔ عورتوں کے جھونپڑوں پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فلورا نے مجھے بتایا کہ یہاں فرانس کے بڑے بڑے خاندانوں کی عورتیں قید پڑی ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ وہ رشوت کے طور پر ہر ماہ وارڈن کو ایک خاص رقم پیرس سے منگوا کر دے دیتی ہیں۔ اس کے عوض وارڈن ان کو کچھ دن تک کھانے کے لئے مچھلی اور کافی وغیرہ پہنچا دیتا ہے۔ مگر اس کے بعد پھر ان کے ساتھ غریب اور جرائم پیشہ قیدی عورتوں والا سلوک شروع ہو جاتا ہے۔

"یہاں کئی قاتل عورتیں بھی ہیں۔ ایسی بھی ہیں جو یونیورسٹی میں لیکچرار تھیں مگر حکومت نے انہیں سیاسی اختلافات کی بنا پر اغوا کر کے یہاں بھجوا دیا ہے۔ ان کی خبر کسی کو معلوم نہیں۔ وارڈن نے اپنی پسند کی قیدی عورتیں الگ سے چھانٹ رکھی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے ان کے پاس رات گزارنے آ جاتا ہے۔ دوسری عورتوں پر یہاں کے پہرے داروں کا قبضہ ہے۔ ہم سے مشقت لی جاتی ہے۔ ہم دریاں بنتی ہیں۔ ٹوکریاں بنتی ہیں۔ کچے چھالیوں سے چھال اتارتی ہیں۔ سوکھے ہوئے ناریلوں کو کوٹتی ہیں۔"

میں نے فلورا سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیا وارڈن تمہارے پاس بھی رات گزار چکا ہے؟"

وہ رک گئی۔ پھر بولی۔

"میں مجبور ہوں۔ یہاں میری کوئی مرضی نہیں ہے۔ میں وارڈن کی غلام ہوں۔ اگر وہ میرے پاس آتا ہے تو میں اسے روک نہیں سکتی۔ وہ مجھ پر بڑے ظلم کرتا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ وہ میرے ساتھ کیسا درندوں والا سلوک کرتا ہے۔ یہ شخص انسان نہیں درندہ ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میں تو یہاں ایک غلام کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ بلکہ غلاموں سے بھی بدتر تم کہہ سکتے ہو۔"

اس کے بعد میں نے فلورا سے وارڈن کے بارے میں کوئی بات نہیں پوچھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کے حالات میں عورتوں کے ساتھ ہمیشہ بڑا ظلم ہوا ہے۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی چلی جا رہی تھی۔ اب میرے کان جزیرے کے گھنٹے کی آواز پر لگے تھے جسے رات کے ٹھیک بارہ بجے بجنا تھا۔ آخر وہ گھڑی بھی آ گئی جب ڈیول آئی لینڈ کے گھنٹے نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ میں اور فلورا اس وقت جاگ رہے تھے۔ ہمیں تو ساری رات جاگنا تھا۔ ہم جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھونپڑے کے آگے ایک بوسیدہ کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ میں نے کپڑا ہٹا کر باہر دیکھا۔ بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ یہ روشنی مجھے پریشان کرنے لگی۔ میں نے فلورا سے کہا۔

"تم باہر نکل کر دیکھو اور جھونپڑے کے پیچھے جا کر بھی ایک نظر ڈالو۔ کوئی پہرے دار تو نہیں ہے۔"

فلورا جلدی سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دبے پاؤں واپس آ کر کہنے لگی۔

"باہر کوئی نہیں ہے"

میں نے اللہ کا نام لیا۔ یا اللہ اب تو ہی میرا حامی و مددگار ہے' کہا اور فلورا سے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلی آنا۔"

جھونپڑی سے نکلتے ہی میں اس کے پیچھے آگیا۔ یہاں کھڑے ہو کر میں نے سامنے کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں مجھے کچھ فاصلے پر ایک کالی دیوار سی نظر آئی۔ یہ کیلے کے درختوں کی دیوار تھی جو بقول کرسٹوف ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے اور جس کی دوسری طرف ہمیں جانا تھا۔ ہم شبنم میں بھیگی ہوئی گھاس میں چلتے کیلے کے درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ یہ درخت ستونوں کی طرح ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ ہم ان کے درمیان سے گزر کر دوسری طرف آگئے۔ یہاں اندھرا ذرا ہلکا معلوم ہوا کیونکہ اوپر آسمان کھلا تھا اور تارے نکلے ہوئے تھے۔ جھاڑیاں اور اونچی نیچی گھاس تھی۔ سامنے کی جانب سے سمندر کی مچھلیوں کی بو والی ٹھنڈی مرطوب ہوا آرہی تھی۔

میں نے فلورا کو سرگوشی میں کہا۔

"میرے پیچھے ہو جاؤ۔ ہو سکتا ہے ہمیں یہاں پہرے دار سے کوئی بات کرنی پڑ جائے۔ ویسے کرسٹوف نے کہا تھا وہ ہمیں دیکھ کر خود ہی پہرے سے ہٹ جائے گا۔"

ہم کھاڑی کے سرے پر پہنچ گئے۔ پہرے دار نے یقیناً ہمیں دیکھ لیا ہو گا لیکن چونکہ اس کو رشوت مل چکی تھی اور اس کے ساتھ بات طے ہو گئی ہوئی تھی اس لئے وہ سامنے نہ آیا۔ اندھیرے میں جیٹی کے لمبے پلیٹ فارم پر ہمیں ایک طرف بڑے بڑے ڈرموں کا ڈھیر دکھائی دیا۔ ہمیں اسی طرف بڑھنا تھا چاروں طرف ایک دہشت ناک سناٹا طاری تھا۔ ہم اس طرح چل رہے تھے کہ ہمارے پاؤں کے نیچے آنے والے سنگریزوں کی بھی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔

ہم ڈرموں کے پاس پہنچ کر جلدی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ فلورا نے سرگوشی کی۔

"تمہارا دوست کہاں ہے؟ وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا"

اتنے میں ایک سایہ ہمارے قریب آگیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ سایہ جھک کر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔

"سلمان! میں ہوں کرسٹوف۔ جلدی سے میرے پیچھے آجاو۔"

ہم کرسٹوف کے پیچھے جھک کر اندھیرے میں چلنے لگے۔ وہ ہمیں ڈرموں کے اونچے ڈھیر کے نیچے لے گیا۔ خالی ڈرموں کی یہ اونچی اونچی دو تین قطاریں تھیں جو ایک دوسرے کے اوپر لگی ہوئی تھی۔ ہم تینوں وہاں بیٹھ گئے۔ کرسٹوف کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ کہنے لگا۔

"میں ڈبل روٹی اور پانی کی بوتلیں ساتھ لے آیا ہوں۔ ہم تین ڈرموں میں بیٹھیں گے۔ میں نے یہ دوسری قطار والے ڈرم چنے ہیں۔"

پھر اس نے تھیلے سے لوہے کی پتری نکالی اور ڈرموں کے ڈھکنوں کے کیل اکھاڑنے لگا۔ کیل آدھے ٹھکے ہوئے تھے۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کے بعد دو ڈرموں کے کیل اکھاڑ دیئے۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر ڈرموں کے ڈھکن اتار دیئے۔ کرسٹوف کہنے لگا۔

"تیسرے ڈرم کا ڈھکن میں آدھا اتاروں گا تاکہ میں اس کے اندر گھس کر اسے دوبارہ بند کر سکوں میں اسے اندر سے اس طرح کھینچ لوں گا کہ ڈھکن باہر سے دیکھنے پر بند ہی معلوم ہو گا۔"

اس نے اندھیرے میں جھک کر اپنے ڈرم کے ڈھکن کی ایک طرف کے کیل اس طرح اکھاڑے کہ وہ اندر کھینچنے سے بند کئے جا سکتے تھے۔ ڈھکن کو اندر کھینچنے کے لئے وہ اپنے ساتھ ایک تار لایا ہوا تھا تار اس نے اندر کی جانب ایک کیل میں پھنسا دی۔ پھر اس نے پانی کی پلاسٹک کی ایک بوتل اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے مجھے دیئے پانی کی ایک بوتل اور روٹی کے تین ٹکڑے فلورا کو دیئے اور بولا۔

"تم لوگ اپنے اپنے ڈرموں میں گھس جاو"

فلورا نے اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔ شاید ان تمام مصیبتوں اور صعوبتوں سے گذرنے کے بعد اسے بھی مجھ سے محبت ہوگئی تھی۔ میں نے اس کے بازو کو دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں فلورا۔ اب ہماری دلیری اور صبر کا امتحان شروع ہو رہا ہے۔ اگر ہم اس میں پورے اترے تو کل کا سورج ہمیں آزادی کی فضاؤں میں سانس لیتا دیکھے گا۔"

فلورا نے میری گردن میں باہیں ڈال کر میرا منہ چوم لیا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی وہ ڈرم میں داخل ہوگئی۔ ڈرم چھوٹا نہیں کافی بڑا تھا۔ یہ ایک بڑے سائیز کا بیرل تھا جو خاص طور پر شراب اور وائن کی بھاری مقدار جزیرے کے افسروں تک پہنچانے کے لئے بنائے گئے تھے۔ کیونکہ جزیرے کی مرطوب آب و ہوا سے بچنے کے لئے وہاں شراب اور وائین زیادہ استعمال ہوتی تھی۔ میں دوسرے ڈرم میں گھس کر بیٹھ گیا۔ کرسٹوف نے کہا۔

"ڈرم کے سوراخ سے تم لوگوں کو تازہ ہوا باقاعدہ آتی رہے گی۔ اندھیرا اور حبس ضرور ہو گا۔ لیکن یہ تم کو ضرور برداشت کرنا پڑے گا۔ صرف ایک رات اور ایک دن کا حبس برداشت کر لو۔ پھر ساری زندگی کے حبس سے بچ جاؤ گے۔"

فلورا کے ڈرم پر پہلے کرسٹوف نے ڈھکن چڑھایا اور ہاتھوں سے کیل سوراخ پر فٹ کر کے اندر دبا دیئے۔ دوسرے ڈرم میں میں بیٹھا تھا۔ میرے ڈرم کے ڈھکن کو بھی کرسٹوف نے اسی طرح بند کر دیا۔ اس کے بعد مجھے اس کے قدموں کی آہٹ دور جاتی محسوس ہوئی۔ میرے ڈرم میں اندھیرا تھا اور رم (RUM) شراب کی خاص قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈرم کا سوراخ ڈھکنے میں نیچے کی طرف تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ سوراخ میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ مجھے فلورا کا خیال آنے لگا۔ وہ

میرے ساتھ والے ڈرم میں تھی۔ میں نے اپنے ڈرم پر تین بار انگلی سے ٹھک ٹھک کی۔ دوسری طرف فلورا نے بھی اپنے ڈرم کی دیوار کو تین بار بجایا۔ ہم آپس میں بول نہیں سکتے تھے۔ بس اسی طرح ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر سکتے تھے۔ میری دوسری جانب کرسٹوف کا ڈرم تھا۔ میں نے اس طرف ڈرم کی دیوار کو انگلی سے بجایا تو کرسٹوف نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر مجھے کرسٹوف کی دھیمی دھیمی دور سے آتی آواز سنائی دی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"یہ کام مت کرو۔ بالکل خاموش ہو کر لیٹے رہو۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اوکے۔"

اور ڈرم میں لیٹ گیا۔ ڈرم میں بڑی سانی سے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گرمی اور حبس کا احساس بڑھ گیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے فلورا کا خیال آنے لگا کہ وہ تو عورت ذات ہے۔ اسے تو بہت تکلیف ہو رہی ہو گی۔ پھر خیال آیا کہ وہ ہمارے ملک کی عورت نہیں ہے امریکہ کی رہنے والی ہے۔ وہ اس قسم کی تکلیفیں سہہ سکتی ہے۔ اچانک مجھے فلورا کے ڈرم کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ پھر اس کی کمزور سی آواز سنائی دی۔

"سلمان ڈیئر! ہم کتنی دیر یہاں رہیں گے؟"

میں نے فلورا سے کہا۔

"فلورا میری بات غور سے سنو۔ اس کے بعد تم نہ تو دیوار کو بجاؤ گی اور نہ ہی مجھ سے کوئی بات کرو گی۔ اوکے؟"

فلورا فوراً سمجھ گئی کہ ایسا کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اسکی آواز سنائی دی۔

"اوکے۔"

پھر چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ ڈرم کے اندر آکسیجن باہر کی نسبت بہت کم تھی جس کی وجہ سے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔ کرسٹوف نے مجھے ہدایت کی تھی کہ ڈرم میں سیدھا لیٹا رہوں اور آہستہ آہستہ سانس لیتا رہوں تاکہ جو محدود آکسیجن باہر سے آتی ہے وہ آہستہ آہستہ تحلیل ہو اور سانس لینے میں تکلیف نہ ہو۔ میں نے ایسا ہی کیا اور لیٹ کر بڑی آہستہ سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس طرح کرنے سے میرے سینے پر جو بوجھ پڑتا تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن حبس اور شراب کی بو برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں اسکا بھی عادی ہو گیا۔ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ایک دن کی بات ہے اور کھلے سمندر میں جانے کے بعد تازہ ہوا تیزی سے اندر آنے لگے گی۔

کچھ دیر ہی گزری ہو گی کہ باہر سٹیمر چلنے کی آواز سنائی دی۔ سٹیمر ہماری جیٹی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم یہاں سے اٹھائے جا رہے تھے۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کرسٹوف کی اطلاع کے برخلاف یہ ڈرم مزید ایک دن وہاں پڑے رہتے۔ سٹیمر کی آواز برابر آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیٹی کے ساتھ آکر لگ گیا ہے۔ آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں ہمارے ڈرموں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے دونوں ٹانگیں ڈرم کے متوازی کھول کر پاؤں سامنے والی دیوار کے ساتھ لگا دیئے۔ تاکہ اگر ڈرم کو رول کیا جائے تو مجھے اوپر نیچے گرنے سے چوٹ نہ لگے۔ یہ بات میں نے جھونپڑی میں فلورا کو بھی بتا دی تھی۔ پھر ڈرموں کو رول کر کے لے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اچانک میرے ڈرم کو دھچکا لگا اور میرا ڈرم بھی آگے کو لڑھکنے لگا۔ میں نے جلدی سے ٹانگیں اکڑا لیں اور پاؤں سامنے ڈرم کی دیوار سے اور مضبوطی سے جما دیئے۔ میں اوپر سے نیچے گھومنے لگا۔ ڈرم زمین پر کچھ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پھر کسی نے اٹھا کر کسی جگہ دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ دیوار کے ساتھ

لگتے ہی مجھے سٹیمر کی دھمک سنائی دی۔ اسکا مطلب تھا کہ میرا ڈرم سٹیمر پر پہنچا دیا گیا ہے۔ اسی طرح فلورا اور کرسٹوف بھی سٹیمر پر آ گئے ہوں گے۔ میں نے دعا مانگی کہ وہ خیریت سے ہوں۔

میرے ڈرم کے اوپر اور بھی ڈرم رکھے جانے لگے۔ میں نے ٹانگیں سمیٹ لیں اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پانی کی بوتل دور پڑی تھی۔ میں نے اسے کھولا اور دو گھونٹ پانی کے پیئے۔ طبیعت ذرا سنبھل گئی۔ ڈرم کے سوراخ میں سے جو تازہ ہوا آ رہی تھی اس میں سے سمندر کی خوشبو آنے لگے۔ سٹیمر کا انجن چل رہا تھا۔ مجھے باہر سے لکڑی کے تختے کھینچنے کی آواز سنائی دی۔ پھر سٹیمر ہلکے سے دھچکے کے ساتھ چل پڑا۔ ہر شے پروگرام کے مطابق ہو رہی تھی۔ میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اسی طرح اگر ہمارے ڈرم بڑے جہاز پر بھی چڑھا دیئے گئے اور سٹیمر سورج نکلنے سے پہلے اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو گیا تو یہ حبس بے جا کی مصیبت جلد کٹ جائے گی۔

سٹیمر ٹھک ٹھک کی آواز پیدا کر رہا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد اس کے انجن کی آواز دھیمی پڑنے لگی۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ ایک طرف گھوم رہا ہے۔ پھر اس کے کسی چیز کے ساتھ لگنے کی آواز آئی اور اس کے بعد سٹیمر کے انجن بند ہو گئے۔ سٹیمر بڑی جیٹی پر کھڑے جہاز کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایک بار پھر باہر سے مزدوروں کے ایک دوسرے کو پکارنے کا شور بلند ہوا۔ ایک بار پھر خالی ڈرموں کو لڑھکا لڑھکا کر جہاز پر لادا جانے لگا۔ ایک بار پھر میرا ڈرم مجھے گول گول گھمانے لگا۔ میں نے دونوں پاؤں ڈرم کی دیوار کے ساتھ مضبوطی سے جما لئے۔ چونکہ ڈرم جہاز پر لگے ہوئے تختے کے اوپر چڑھایا جا رہا تھا اس لئے وہ آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر میرا ڈرم ایک طرف کو گھوم گیا۔ پھر سیدھا ہو کر لڑھکایا جانے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ خالی ڈرموں کو ڈیک پر ایک طرف لگایا جا رہا تھا۔ ڈیک پر ڈرم لگا دیا گیا۔ میرے اوپر دوسرے خالی ڈرم

رکھے جانے لگے۔ میں نے سوراخ میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ میں ایک جہاز کے عرشے پر تھا۔ عرشے کی بتیاں جل رہی تھیں۔ مجھے دوسرے ڈرم بالکل نہ دکھائی دیئے۔ غالباً انہیں میرے ساتھ ہی لگا دیا گیا تھا۔ کرسٹوف اور فلورا یا تو میرے ساتھ تھے یا میرے اوپر تھے اور یا کافی فاصلے پر تھے۔ جہاز کے انجن پہلے ہی سے چل رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ صرف ہمارے ڈرموں کا انتظار کر رہے تھے اور باقی ساز و سامان پہلے سے جہاز پر لاد دیا گیا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ اب شام تک یعنی فرنچ گیانا کی بندرگاہ یا اس کے کسی قریبی جزیرے کی جیٹی تک پہنچنے تک میں آرام سے لیٹ سکوں گا۔ میں نے بوتل میں پانی کا ایک گھونٹ پیا اور ڈرم میں اس طرح لیٹ گیا کہ میرا سر ڈرم کے سوراخ کے پاس تھا جس میں سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ ضرور کرسٹوف اور فلورا نے بھی اسی حکمت عملی پر عمل کیا ہو گا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ جہاز کو ایک ہلکا سا دھچکا لگا اور وہ چل پڑا۔ مجھے کسی کسی وقت گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ لگتا تھا کہ میں قبر میں بند ہو گیا ہوں اور اب یہاں سے کبھی باہر نہیں نکل سکوں گا۔ اس وقت مجھے اپنی قبر یاد آنے لگی جس میں مجھے مرنے کے بعد دفن کیا جانا تھا۔ میرا جسم خوف سے کانپ گیا۔ میں نے ہاتھ سینے پر باندھ کر خدا سے دعا مانگی کہ اے اللہ میاں قبر کے عذاب سے بچانا۔ میں نے دل میں اسی وقت عہد کر لیا تھا کہ آئندہ کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ جہاز آہستہ آہستہ سمندر میں چلا جا رہا تھا۔ ڈرم کے سوراخ میں سے سمندر کی ہوا آ رہی تھی۔ مجھے سوراخ کے پاس منہ رکھنے سے کافی سکون مل گیا تھا۔

اس جہاز نے سارا دن سمندر میں سفر کرنے کے بعد شام کو کسی وقت اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ میں اس شیطانی جزیرے سے فلورا کو بھی اپنے ساتھ لے آنے میں خدا کا بار بار شکر ادا کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے فرار کی خبر دن نکلنے کے بعد ہی ہو گی۔ کیونکہ شیطان صفت وارڈن کو معلوم ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس رات گزارنے

گیا ہوا ہوں۔ اور عورتوں کے حصے کے جو پہرے دار ہیں وہ بھی یہ جانتے ہیں کہ میں فلورا نام کی قیدی عورت کی جھونپڑی میں وارڈن کے حکم سے رات گزارنے آیا ہوں۔ ظاہر ہے دن نکلنے کے بعد اگر انہیں کوئی شک پڑ گیا تو وہ فلورا کی جھونپڑی میں گھس کر دیکھیں گے کہ میں بیوی کے ساتھ سویا ہوا ہوں۔ صرف کرسٹوف کے فرار کا صبح کو علم ہو جانا لازمی بات تھی۔ اسی وقت اس کی تلاش شروع ہو جائے گی جب وہ کہیں نہیں ملے گا تو جزیرے کے الارم چیخ اٹھیں گے اور جب وارڈن کو یہ خبر ملے گی کہ میں بھی فلورا کے ساتھ غائب ہو چکا ہوں تو ساری سیکورٹی الرٹ ہو جائے گی۔ اور صبح جو بحری جہاز چلا تھا اس پر وائرلیس کے ذریعے تین قیدیوں کے فرار کی اطلاع نشر ہو جائے گی اور اس میں یہ بھی حکم دیا جائے گا کہ جہاز کی تلاشی لی جائے یا جہاز کو اسی طرح واپس لایا جائے۔ کیونکہ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ اگر قیدی جزیرے پر کہیں نہیں ہیں تو وہ ضرور اسی جہاز کے ذریعے فرار ہوئے ہوں گے اور ابھی تک جہاز میں کسی جگہ چھپے ہوں گے۔

ان خدشات کے پیش نظر مجھے تشویش ضرور تھی میں بس یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کسی طرح ایسا ہو کہ دوپہر تک کم از کم میرے اور فلورا کے فرار کا علم وارڈن کو نہ ہو۔ کیونکہ صرف ایک قیدی کرسٹوف کی گمشدگی کے سلسلے میں یہ لوگ صرف جنگل وغیرہ میں ہی اسے تلاش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ ایک اطمینان' بلکہ تھوڑا سا اطمینان ضرور تھا کہ اگر جہاز شیطانی جزیرے میں واپس لایا بھی گیا اور اسکی تلاشی بھی لی گئی تو خالی ڈرموں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا۔ پھر خیال آتا کہ اس قیدی کیمپ یعنی شیطانی جزیرے کا وارڈن کوئی احمق آدمی نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جہاز پر لدے ہوئے خالی ڈرموں کی بھی تلاشی لی جائے۔ کیونکہ اسے معلوم ہو گا کہ یہ ڈرم جہاز پر اسی شیطانی جزیرے پر سے لادے گئے تھے۔

اس قسم کے پریشان کن خیالات مجھے ڈرم کے اندر بھی پریشان کئے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے پکڑے جانے کی صورت میں میری فلورا اور کرسٹوف کی عبرت ناک بلکہ اذیت ناک موت یقینی تھی۔ میرا ڈرم کچھ زیادہ ہی ہلنے لگا تھا۔ میں نے سوراخ میں سے باہر دیکھا دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر دھوپ نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ سوراخ میں سے ہوا بھی تیزی سے ڈرم کے اندر آنے لگی تھی۔ مجھے سامنے ڈیک کا جنگلہ دکھائی دے رہا تھا۔ جہاز کے ملازم تیز تیز قدموں سے ادھر ادھر چیزیں اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ یہ اوپر ڈیک تھا۔ ہمارے ڈرم دوسرے خالی ڈرموں کے ساتھ باندھ کر اوپر والے ڈیک پر رکھے ہوئے تھے۔ جہاز ڈول رہا تھا۔ ڈرم کبھی دائیں طرف جھک جاتا تھا کبھی بائیں طرف جھک جاتا تھا۔ سمندر میں تیز ہوا چل رہی تھی۔ مجھے خیال آتا کہ جہاز اگر زیادہ ڈولنے لگا تو کہیں رسی ٹوٹ نہ جائے اور ڈرم لڑھکتے ہوئے سمندر میں نہ گریں۔ ہم تینوں یعنی میں کرسٹوف اور فلورا ایک دوسرے سے الگ ہو چکے تھے۔ ہمارا آپس میں کوئی رابطہ نہیں تھا۔ لیکن وہ دونوں بھی اپنے اپنے ڈرموں میں بند جہاز کی بڑھتی ہوئی رولنگ سے ضرور پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں نے تھیلے میں سے تھوڑی سی ڈبل روٹی نکال کر کھائی۔ بوتل میں سے پانی پیا۔ میرا ناشتہ ہو گیا تھا۔

ڈرم کے اندر جہاز کی رولنگ کی وجہ سے میں کبھی ادھر ہو جاتا کبھی ادھر لڑھک جاتا تھا۔ آخر میں نے اپنے پاؤں ڈرم کی دیوار کے ساتھ مضبوطی سے جما دیئے۔ لیکن میں جلدی تھک گیا۔ آخر کتنی دیر تک میں اپنے پاؤں اس طرح جمائے رکھ سکتا تھا۔ جہاز کی رولنگ آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی۔ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے میرے ڈرم کے اوپر جو خالی ڈرم رکھا ہوا تھا اس پر بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہوں۔ یہ بارش کی آواز تھی۔ بادلوں کی گرج سنائی دی اور بارش ایکدم سے تیز ہو گئی۔ ساتھ ہی ہوا نے

بھی طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ یا اللہ خیر! میں نے سوراخ میں سے بڑی مشکل سے باہر دیکھا۔ جہاز کے ڈیک کا جنگلہ کبھی اوپر جاتا تھا۔ کبھی نیچے آجاتا تھا۔ جب وہ نیچے آتا تو مجھے سمندر کی بپھری ہوئی لہریں نظر آتیں۔ یہ طوفان تھا۔ سمندری طوفان۔!

میں نے سمندری طوفان کی بہت کہانیاں پڑھی ہوئی تھیں کہ کس طرح جہاز سمندر کے طوفان میں پھنس کر ڈوب گیا اور جہاز کا سارا عملہ ساتھ ہی غرق ہو گیا۔ یا پھر کچھ لوگ لکڑی کے تختے سے چمٹ گئے اور پھر کس طرح وہ بھوکے پیاسے سمندر میں سفر کرتے رہے کئی مر گئے۔ جو زندہ رہے ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ واقعی اگر طوفان شدید ہو گیا تو یہ جہاز جو زیادہ بڑا نہیں تھا اور دیکھنے میں بھی بوسیدہ اور پرانا لگتا ہے ضرور ڈوب جائے گا۔ ڈرم ہچکولے کھا رہے تھے۔ ان کی چرچراہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔ بارش کی بوچھاڑیں طوفانی ہو رہی تھیں اور ڈرم کے سوراخ میں سے چاروں طرف دھند ہی دھند پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔

میں ڈرم کے ساتھ چھپکلی کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ جہاز کے انجن چلنے کی دھمک برابر محسوس ہو رہی تھی۔ ڈرم کے سوراخ میں سے سمندری تیز ہواؤں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو ڈرم بھی اس کے ساتھ ہی سمندر میں ڈوب جائیں گے۔ میں کیا کروں گا؟ اگر ان کی رسی ٹوٹ گئی تو سارے ڈرم لڑھک کر ڈیک کے جنگلے پر سے اچھل کر سمندر میں گر پڑیں گے اور خالی ہونے کی وجہ سے ڈوبیں گے تو نہیں مگر طوفانی موجیں انہیں خدا جانے کہاں سے کہاں لے جائیں گی۔ یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہ موجیں ہمیں واپس شیطانی جزیرے پر ہی نہ پھینک دیں۔ چونکہ سارے ڈرموں کے سوراخ کھلے تھے اس لئے قدرتی بات تھی کہ آہستہ آہستہ سمندر کا پانی ان میں جائے گا اور وہ ہم تینوں کو لے ڈوب جائیں گے۔ ڈرم کے

سوراخ کا ڈاٹ باہر کی جانب تھا۔ میں نے دو ایک بار سوراخ میں سے ہاتھ باہر نکال کر ڈاٹ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر ڈاٹ کی رسی میرے ہاتھ آگئی۔ ڈاٹ اسی رسی کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اسے اوپر کھینچا مشکل یہ پیش آگئی کہ ڈاٹ باہر سے بند کیا جاتا تھا۔ اندر سے میں اسے سوراخ کے ساتھ تو لگا سکتا تھا مگر مضبوطی سے اس طرح بند نہیں کر سکتا تھا کہ اندر سمندر کا پانی نہ آئے۔ میں نے ہاتھ ڈرم کے اندر کر لیا۔

بجلی بار بار چمکنے لگی۔ بادل کڑکنے لگے۔ گرجنے لگے۔ بارش تیز ہو گئی۔ جہاز رولنگ کے ساتھ ساتھ اب ہچکولے بھی کھانے لگا تھا۔ ڈرم کے اندر میں بھی ادھر ادھر لڑھک رہا تھا۔ اچانک جہاز کو ایک دھچکا لگا۔ اس کے بعد دوسرا دھچکا لگا اور جہاز ایک طرف کو جھک گیا۔ مجھے بارش اور بادلوں اور سمندر کی طوفانی موجوں کے قیامت خیز شور میں ڈیک پر جہاز کے عملے کی گھبرائی ہوئی آوازیں اور ادھر ادھر دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ڈرم کی دیوار سے ٹانگیں جمائے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ جہاز کو ایک دھچکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی کڑکڑاہٹ کی آواز آئی اور میرا ڈرم کھل گیا اور میں اوپر نیچے گرنے لگا۔ میرا ڈرم ڈیک پر لڑھک رہا تھا۔ پھر وہ بڑے زور سے عرشے کے جنگلے کے ساتھ ٹکرا کر اچھلا اور سمندر میں گر پڑا۔ مجھے اس وقت پتہ چلا جب ڈرم کے سوراخ میں سے سمندر کا پانی تیزی سے اندر آنا شروع ہو گیا۔ میں نے ہاتھ ڈال کر رسی کو کھینچ کر ڈاٹ سے سوراخ بند کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اگر ڈرم کسی طرح سمندر کے اندر چلا جاتا تو ہوا کے دباؤ کی وجہ سے پانی اندر نہیں آسکتا تھا مگر خالی ہونے کی وجہ سے ڈرم طوفانی موجوں کے اوپر ادھر ادھر اچھل رہا تھا جسکی وجہ سے پانی کو ڈرم کے اندر آنے کا برابر موقع مل رہا تھا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ ڈرم پانی سے بھر جائے گا اور میں ڈرم کے اندر ہی ڈوب کر ہلاک ہو جاؤں گا۔ میں نے ڈرم سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈرم کا ڈھکنا کرسٹوف نے پوری طرح سے بند نہیں کیا تھا اور اس میں کیل پورے نہیں ٹھونکے تھے۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے زور سے ڈرم کے ڈھکنے کو لاتیں مارنی شروع کر دیں۔ لکڑی کا ڈھکنا زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ کیل بھی آدھے آدھے ٹھکے تھے۔ تین چار بار لاتیں مارنے سے ڈھکنا اکھڑ گیا۔ ڈھکنا کیا اکھڑا ڈرم میں سمندر کا طوفان آگیا۔ پانی ایکدم اندر آیا اور اس نے مجھے ڈرم کی چھت کے ساتھ لگا دیا۔ میں پوری طرح پانی میں ڈوب چکا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ مجھے تیرنا نہیں آتا تھا۔ موت سامنے نظر آجائے تو آدمی ہر طرح سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اس کے اندر ایک طاقت بھی آجاتی ہے۔ میں زور لگا کر بازو چلاتا ڈرم سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی طوفانی سمندر کی پہاڑ ایسی ڈوبتی ابھرتی موجوں نے مجھے کھلونے کی طرح ادھر ادھر اچھالنا شروع کر دیا۔ بارش بڑے زور کی ہو رہی تھی۔

سمندر میں آتے ہی مجھ پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ میرے ہاتھ پیر سن ہو گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ میری موت کا وقت آن پہنچا تھا۔ لاہور کے دوست گھر والے رشتے دار لاہور کی سڑکیں سب کچھ فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگا۔ میں نے دو تین بار ہاتھ پیر مارے مگر یہ سب کچھ بے فائدہ تھا۔ سمندر کی بپھری ہوئی پہاڑ ایسی موجیں مجھے اٹھا کر کبھی اوپر ہی اوپر لے جاتیں اور پھر نیچے گہرائی میں لے آتیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سمندر کا پانی مجھے سطح کے اوپر ہی رکھے ہوئے ہے۔ طوفانی موجوں کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے میں ایکدم ڈوبنے سے ابھی بچا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن مجھے زندہ رہنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

ایک بار سمندر کی موجیں مجھے اٹھا کر اوپر لائیں تو میں نے چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ تیز بارش کی دھند میں مجھے کچھ فاصلے پر دو سرے ڈرم بھی تیرتے نظر آئے۔ عجیب بات تھی کہ میرے ڈرم میں پانی بھر گیا ہوا تھا مگر وہ ڈوبا نہیں تھا۔ اور لہروں کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ سمندر کا پانی وسط سمندر میں دریا کی طرح کسی ایک سمت کو نہیں بہتا بلکہ وہیں وسیع علاقے میں اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ اگر کوئی ساحل قریب ہو تو سمندری موجیں ساحل کی طرف ضرور دوڑنے لگ جاتی ہیں۔ وہاں دور دور تک ساحل کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس واسطے سمندر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ڈرم کو پکڑنے کی کوشش کی مگر میں پکڑ نہ سکا۔ جہاز کہیں نہیں نظر آ رہا تھا۔ کوئی دوسرا انسان بھی نہیں آ رہا تھا۔ چھ سات ڈرم ضرور میرے قریب لہروں کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہے تھے۔

مجھے کرسٹوف کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میری طرح ضرور ڈرموں سے باہر نکل گئے ہوں گے انہیں تو سمندر میں تیرنا بھی آتا تھا۔ وہ زندہ حالت میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکے ہوں گے۔ بارش رک گئی۔ ہوا کی شدت بھی کم ہو گئی تھی مگر سمندر اسی طرح بپھرا ہوا تھا۔ مجھے خونخوار شارک مچھلیوں کا بھی خوف تھا کہ کہیں نیچے سے کوئی شارک مچھلی مجھے ہڑپ نہ کر لے۔ میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ سمندر کا پانی کڑوا اور سرد تھا۔ میں یونہی ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ مجھے موجیں ایک طرف دھکیل رہی تھیں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سمندر میں ایک جانب چلا جا رہا ہوں۔ ایک بار میں موجوں کے ساتھ اٹھا تو مجھے لکڑی کا ایک تختہ نظر آیا۔ شاید یہ تباہ شدہ جہاز کا تختہ تھا جو چوڑے شہتیر کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس قسم کے تختے جہازوں پر کشتیوں کے علاوہ بھی رکھے جاتے ہیں تاکہ اگر جہاز ڈوبنے لگے تو لوگ اس پر بیٹھ کر اپنی جانیں بچا سکیں۔ یہ تختہ خالی تھا۔

میں لہروں کے ساتھ ایک بار پھر نیچے چلا گیا۔ جب اوپر آیا تو تختہ میرے مزید قریب آ گیا ہوا تھا۔ تیسری بار سمندری موجوں نے مجھے اچھالا تو تختے پر میرا ہاتھ پڑ گیا۔ اس کے ساتھ رسے لٹک رہے تھے۔ میں نے ایک رسے کو پکڑ لیا۔ تختہ مجھے اپنے ساتھ اوپر نیچے لے جانے لگا۔ میں پورا زور لگا کر اپنی ایک ٹانگ تختے کے اوپر رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ کتنی دیر میں اسی طرح تختے کے ساتھ ہی اوپر نیچے ہوتا رہا۔ موجوں کے تھپیڑوں کی وجہ سے میرا جسم دکھنے لگا تھا۔ میں نے ہمت کر کے دوسری ٹانگ بھی تختے کے اوپر رکھ لی۔ اب میں تختے پر اوندھے منہ پڑا تھا اور تخت طوفانی موجوں کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ میری جان بچ گئی تھی۔ میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میرے جسم میں بالکل جان نہیں ہے۔ میں نے تختے کے رسے کو اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ دل طوفانی موجوں کے شور سے دہل رہا تھا۔ خدا جانے میں کب تک اسی طرح تختے پر پڑا رہا۔ تختہ موجوں کے رحم و کرم پر تھا۔ کافی دیر گزر گئی تو مجھے احساس ہوا کہ سمندر کا جوش کم ہو گیا ہے۔ میں لیٹے لیٹے لڑھکتا ہوا تختے کے درمیان میں چلا گیا۔ یہاں بھی لوہے کی بڑی بڑی ہکوں کے ساتھ رسیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک رسی کو اپنے گرد اس طرح لپیٹ لیا کہ میں سمندر میں گرنے سے بچ سکتا تھا۔ بارش پہلے ہی رک چکی تھی۔ طوفان کا زور بھی کم ہو گیا تھا۔ ہوا کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ میرا تختہ سمندر میں کافی دور نکل گیا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ سمندر کا ہیجان کم ہوا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اردگرد سمندر کا جائزہ لیا۔ مجھے دور دور تک سمندر میں کوئی ڈرم نظر نہ آیا اور کوئی تختہ اور کشتی بھی نہ دکھائی دی۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو گیا تھا۔ فلورا اور کرسٹوف زندہ نہیں بچے ہوں گے۔ حیرت کی بات ہے مجھے فلورا اور کرسٹوف کا اتنا غم نہیں تھا جتنی خوشی مجھے اپنے بچ جانے کی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ قدرتی بات ہو ایک موہوم سی امید ضرور تھی کہ شاید وہ دونوں بھی ڈرم سے نکل کر دور

سمندر میں گرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں اور کوئی ایسا ہی تختہ ان کے ہاتھ آ گیا ہو اور وہ زندہ ہوں۔ مگر میرے آس پاس حد نظر تک سمندر خالی تھا۔ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ میرے پاس جو پانی کی پلاسٹک کی بوتل اور ڈبل روٹی والا تھیلا تھا وہ خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ سمندر میں جہازوں کے ڈوب جانے اور بعض مسافروں کے زندہ بچ جانے کے جو میں نے قصے پڑھے تھے ان میں بتایا گیا تھا کہ جب آدمی کسی کشتی یا تختے پر جان بچا کر کھلے سمندر میں نکل آتا ہے تو سب سے بڑا مسئلہ پانی کا ہوتا ہے۔ سمندر کا پانی کڑوا ہوتا ہے اگر آدمی اسے پی لے تو وہ باہر آ جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ دن کے وقت سورج کی تپش اور دھوپ کی چمک سے بچنے کا ہوتا ہے۔ سمندر میں جب سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا ہے تو آدمی کی کھال چمکنے لگتی ہے اور دھوپ سمندر کے پانی پر پڑتی ہے تو اس کی چمک سے آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں اور یہ چمک آدمی کو اندھا بھی کر دیتی ہے۔ میرے پاس پینے کے لئے پانی نہیں تھا۔ میری قمیض اور پتلون گیلی ہو چکی تھی۔ پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک آسمان ابر آلود تھا اور سورج نہیں نکلا ہوا تھا۔ یہ خط استوا کا علاقہ تھا۔ یہاں ویسے بھی دھوپ گرمیوں میں سخت گرم ہوتی ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جہاز جہنمی جزیرے سے فرنچ گیانا کی طرف جا رہا تھا۔ جہاز کو چلے چار چھ گھنٹے ہو چکے تھے جب سمندری طوفان نے اسے گھیرا تھا۔ اس اعتبار سے جہاز تقریباً آدھا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ اگر میرا تختہ سمندر میں اسی طرف سفر کر رہا تھا تو عین ممکن تھا کہ شام تک مجھے زمین نظر آ جائے۔ مگر میں نے غور سے دیکھا کہ میرا تختہ سمندر میں ایک ہی جگہ اوپر نیچے ہوتے ہوئے معلوم ہوا۔ حقیقت یہ تھی کہ کھلے سمندر میں اسکی موجیں وسیع و عریض علاقے میں اوپر نیچے ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ میرا تختہ بڑی بڑی موجوں کے دوش پر سوار اوپر جا کر جب نیچے آتا تھا وہ کم از کم تین چار میل کا فاصلہ طے

کر لیتا تھا۔ لیکن مجھے ایسے ہی لگتا جیسے میرا تختہ ایک جگہ پر ہی رکا ہوا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو قسمت اور موجوں کے حوالے کر دیا۔ میں تختے پر اپنے جسم کے گرد رسی باندھ کر سیدھا لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عجیب بات ہے کہ مجھے نیند آنا شروع ہو گئی۔ اور میں جیسے کسی جھولے پر لیٹا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

کسی آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایک آبی پرندہ جو بگلے کی طرح تھا، تختے کے کنارے پر بیٹھا زور زور سے بول رہا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے جگا دیا تھا۔ دن کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک سوتا رہا تھا۔ سونے سے میری کچھ توانائی بحال ہو گئی تھی۔ مگر مجھے بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سمندر پر ایک نگاہ ڈالی تو خوشی سے میرا دل اچھل پڑا۔ کچھ فاصلے پر سیاہ لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ یہ زمین کی نشانی تھی۔ اصل میں وہ بگلا بھی اس بات کی دلیل تھی کہ زمین قریب ہی ہے۔ میں بے تابی سے سیاہ لکیر کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا تختہ اسی طرف جا رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ سیاہ لکیر اونچے اونچے ٹیلوں میں بدل گئی۔ یہ یا تو کوئی ویران جزیرہ تھا یا میں فرنچ گیانا کے ساحل پر پہنچنے والا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ زمین مجھے اپنی آغوش میں لینے والی تھی۔ میں مرنے سے بچ گیا تھا۔ خدا نے میری دعائیں قبول کر لی تھیں۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ میں شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان اٹلانٹک سمندر میں ہوں اور یہاں ایسے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی ہیں جن کا نقشے پر کوئی وجود نہیں ہے۔ سانگوش نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ اس سمندر میں بعض جزیروں پر آدم خور جنگلی بھی رہتے ہیں۔ ان کے خیال سے میرا دل بیٹھ سا گیا۔ لیکن زندہ بچ جانے کے خیال نے مجھے ایک نئی زندگی عطا کر دی تھی اور میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔

سمندر کی موجوں نے میرے تختے کو جزیرے کے ساحل پر لا پھینکا۔

میں نے اپنے جسم کے گرد بندھی رسی کھولی اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا پانی میں اتر گیا۔ واپس آتی ہوئی سمندر کی طویل موج میرے گھٹنوں کو پیچھے دھکیلتی گزر گئی۔ میں نے تختے کو پکڑ لیا تھا۔ ورنہ یہ جھاگ اڑاتی تند و تیز موج مجھے اپنے ساتھ بہا کر ایک بار پھر سمندر کے حوالے کر دیتی۔

سمندر کے ساحل پر دور تک زرد رنگ کی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے درختوں کی قطار ساحل کے ساتھ مشرق اور مغرب دونوں جانب چلی گئی تھی۔ درخت اونچے نیچے تھے۔ پہلے میں انہیں کھجور کے درخت سمجھا۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ ناریل کے درخت تھے۔ کتنے ہی ناریل درخت سے نیچے گرے ہوئے تھے۔ ان میں تازہ بھی تھے اور باسی بھی۔ میں نے ایک ناریل پتھر سے توڑ کر اسکا پانی پیا اور پیاس بجھائی۔ اسکی جتنی گری کھرچ کر کھا سکتا تھا' کھائی۔ ذرا طبیعت بحال ہوئی تو وہیں ساحل پر درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ کہیں آس پاس جزیرے پر آدم خور جنگلی نہ رہتے ہوں۔ شام ہو رہی تھی۔ خیال آیا کہ گھوم پھر کر مجھے جزیرے کا جائزہ لینا چاہیے۔ پھر خیال آیا کہ نہ جانے جزیرہ کتنا وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ رات ہونے والی ہے۔ کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی چاہیے کہ جہاں رات گزاری جا سکے۔

اچانک مجھے تختے کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کا خیال آ گیا۔ یہ رسیاں میرے کام آ سکتی تھیں۔ میں دوڑ کر واپس آ گیا اور سمندر کے کنارے ریت پر جہاں بہت بڑا تختہ ابھی تک ویسے ہی پڑا تھا۔ آتی جاتی لہروں نے صرف اسکا رخ موڑ دیا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ تختہ تو بڑی نعمت ہے۔ اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ یہاں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی کہ میں اس پر بیٹھ کر سمندر میں فرار ہو سکتا ہوں۔ چنانچہ میں تختے کی رسیوں کو پکڑ کر ریت پر کھینچنے لگا۔ تختہ بھاری تھا۔ میں دور سے آتی لہر کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی لہر اس سے ٹکرائی۔ تختہ اونچا ہو گیا۔ میں نے زور لگا کر اسے کھینچنے لگا۔ تختہ میرے زور اور لہر کے زور کے ساتھ ساول کی ریت پر کافی آگے آ گیا۔ لہر واپس چلی گئی۔ اب تختہ ریت پر ہی تھا۔ اس سے آگے میں اسے لے جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اکیلا آدمی اسے نہیں کھینچ سکتا تھا۔ میں نے اس کی بکوں کے ساتھ بندھی ہوئی تین چار رسیاں کھول کر انہیں آپس میں گرہیں دے کر ایک لمبی رسی بنائی۔ اسے اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور رختوں کے نیچے آ گیا۔

جزیرے میں ان درختوں کے پیچھے بھی درخت جھاڑیاں اور تھیں اور ان کے پیچھے بڑے بڑے بھورے اور سبز رنگ کے مخروطی شکل کے پتھر زمین سے باہر نکلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے غروب ہوتا ہوا سورج نہیں نظر آ رہا تھا مگر بادلوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور دن کی روشنی سرمئی رنگت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جزیرے کے اندر جاتے ہوئے مجھے شام کے اندھیرے میں ڈر لگ رہا تھا۔ میں ساحل کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔ ریت کا رنگ کہیں زرد اور کہیں سرخ تھا۔ اسی رنگ کے سنگ ریزے بکھرے ہوئے تھے۔ آگے جا کر ساحل ایک طرف مڑ گیا۔ دوسری طرف بھی سمندر اور ساحل کے درخت تھے لیکن یہاں سمندر میں چٹانیں تھیں۔ یہ بڑی اور چھوٹی ہر قسم کی پانی میں ڈوبی ہوئی چٹانیں تھیں۔ کئی چٹانیں ریت پر

کھڑی تھیں اور سمندر کا پانی ان تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ میں نے درختوں کی بجائے ان چٹانوں میں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ درختوں سے ویسے بھی مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں رات کو وہاں سانپ اور چیونٹیاں حملہ نہ کر دیں۔ میں قریب جا کر ایک ایک چٹان کا جائزہ لینے لگا۔ سب چٹانیں بالکل سیدھی اوپر کو چلی گئی تھیں۔ ایک چٹان کو میں نے دیکھا جو خشک ساحل پر تھی اور اس میں سمندر کی جانب ایک گہرا شگاف بنا ہوا تھا۔ یہ شگاف شاید جوار بھاٹا کی موجوں نے بنا دیا تھا۔

شگاف کافی گہرا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ بس پتھریلا فرش ہی تھا۔ اس فرش پر بھی کچھ سیپیاں نظر آئیں۔ میں نے سوچا رات بسر کرنے کے لئے یہ بہترین جگہ ہے۔ صبح اٹھ کر معلوم کروں گا کہ یہ جزیرہ کونسا ہے۔ کس سمندر میں ہے اور کیا یہاں کوئی امن پسند جنگلی قبیلہ آباد ہے۔ میں احتیاطاً دو ناریل جنگل سے اٹھا کر لے آیا تھا کہ اگر رات کو بھوک اور پیاس لگے تو ان سے کام لیا جا سکے۔ جزیرے کے درختوں پر شام کے وقت بسیرا کرنے والے پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ سمندر پر سکون ہو چکا تھا۔ اس کی موجیں دور دور سے آ کر ساحلی چٹانوں سے ٹکرا کر معمولی سا شور پیدا کر دیتیں اور سکون کے ساتھ واپس چلی جاتیں۔ جیسے جیسے رات کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا پرندوں کی آوازیں بھی غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر سارے ماحول پر ایک گہرا سکوت چھا گیا۔ اس سکوت میں صرف سمندر کی لہروں کا ہلکا شور ہی مخل ہو رہا تھا۔ میں چٹان کے اندر جگہ بنا کر لیٹ گیا۔ شگاف میں میری ٹانگیں سیدھی نہیں ہوتی تھیں۔ میں اس رخ لیٹ گیا کہ شگاف سے میری ٹانگیں باہر آ گئیں۔

خیال تھا کہ سمندر کے تباہ کن سفر کا تھکا ہارا ہوں' جلدی نیند آ جائے گی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اگر آسمان پر تارے چمک رہے

ہوتے تو کچھ نہ کچھ ضرور دکھائی دیتا مگر آسمان بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا جسکی وجہ سے رات کی تاریکی مزید گہری ہو گئی تھی۔ سمندر کی طرف سے بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس ہوا نے تھپکیاں دے کر واقعی مجھے سلا دیا۔

جس وقت آنکھ کھلی تو ہر طرف صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک ویران جزیرے پر کوئی جانور آ کر مجھے رات کو دبوچ بھی سکتا تھا۔ رات کا بچا ہوا ایک ناریل میرے پاس ہی پڑا تھا۔ اسے چٹان سے ٹکرا کر توڑا اور اسکا پانی پی کر پیاس بجھائی اور تھوڑا بہت گودا نکال کر بھوک مٹائی۔ اب میں اس جزیرے کا سروے کر کے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ جزیرہ سمندر کے کس حصے میں ہے اور یہاں سے قریبی مہذب ملک کونسا ہے۔ یا اگر یہ جزیرہ بالکل ہی غیر آباد ہے تو یہاں سے نکل کر مجھے کدھر جانا چاہیے۔ کیونکہ میرے پاس صرف وہی تختہ ہی سفر کا ذریعہ تھا اور سفر کا بھی کوئی رخ نہیں متعین کر سکتا تھا۔ بس اس پر بیٹھ کر سمندر میں نکل پڑنا تھا۔ یا قسمت یا نصیب۔ مقدر تختے کو جس طرف چاہے لے جائے۔ لیکن اس خطرناک طریقے سے میں سمندر میں سفر کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ دل میں یہی خواہش تھی کہ کاش جزیرے کی دوسری جانب کوئی آبادی ہو۔ لوگ بھی تھوڑے مہذب ہوں اور یہاں سے کسی ملک کو سٹیمر یا جہاز بھی جاتے ہوں۔

میں شگاف سے نکل کر ساحل کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف چلنے لگا۔ چٹانیں پیچھے رہ گئیں۔ آگے ایک جگہ سمندر کھاڑی کی شکل میں جزیرے کے اندر دور تک چلا گیا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی جزیرے کے اندر جانا پڑا۔ پہلے تو ساحل کھلا کھلا اور خالی تھا۔ پھر گھنی جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ ان کے درمیان مجھے پگڈنڈی بنی ہوئی دکھائی دی۔ میں اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ پگڈنڈی کبھی قدرتی نہیں ہوتی۔ لوگوں کی آمد و رفت سے بنتی ہے۔ تو کیا یہاں سے لوگ آتے جاتے ہیں؟ اس خیال نے میرے دل میں امید کی شمع روشن

کر دی کہ میں اب امریکہ واپس جا سکوں گا۔ میں پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں تو آگے ایک سرسبز ٹیلا آ گیا۔ اس خیال سے کہ ٹیلے کے دامن میں کوئی گاؤں ہو گا' میں ٹیلے کی طرف چلا۔ ٹیلا زیادہ دور نہیں تھا۔ راستے میں سمندر کا پانی ایک ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ اس ندی پر ناریل کے دو تین درخت ڈال کر ایک پل بنا دیا گیا ہوا تھا۔ یہ کام بھی انسانوں کا تھا۔ درختوں کے پل پر سے گزر کر میں ندی کی دوسری طرف آ گیا۔

ابھی میں ندی کے دوسرے کنارے چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ جھاڑیوں میں زبردست سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے رک کر اس طرف دیکھا۔ پھر ایسی پھنکار اور ڈکاری چیخ بلند ہوئی کہ میں خوف کے مارے پتھر بن گیا۔ میری نظر ایک مگرمچھ سے بھی بڑے سائیز کے ایک گرگٹ پر پڑی جو منہ کھولے میری طرف لال لال آنکھوں سے دیکھتا ہوا اپنی زبان چلا رہا تھا۔ وہ میری طرف جھپٹا۔ میں وہیں سے واپس دوڑا۔ دوڑتے دوڑتے ندی پار کی۔ پگڈنڈی پر بھی دوڑتا گیا۔ آگے ریتلا ساحل آ گیا۔ میں سمندر کی طرف بھاگا۔ پیچھے دیکھا۔ وہ عفریت نما گرگٹ درختوں کے نیچے لیٹا گردن اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا اور پھنکاریں مار رہا تھا۔

میں دوڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں اس چٹان سے بھی آگے نکل گیا جہاں میں نے رات گزاری تھی۔ اب میں اس جگہ پر آ گیا جہاں ریت پر ایک جانب میرا تختہ پڑا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر تختے پر چڑھ گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' عفریت مجھے کہیں نہ دکھائی دیا۔ میں تختے پر بیٹھ گیا اور سانس درست کرنے لگا۔ میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ جب میرا سانس ذرا بحال ہوا تو میں سوچنے لگا کہ ضرور یہ جزیرہ اس قسم کے عفریتوں سے بھرا ہوا ہو گا۔ میں دیر

تک تختے پر ہی لیٹا رہا۔ لیکن مجھے ابھی جزیرے کے بارے میں بھی معلوم کرنا تھا جس میں پگڈنڈی بنی ہوئی تھی اور جہاں ندی پر درخت ڈال کر پل بنایا گیا تھا۔

سوچتا کہ کہیں یہ آدم خور قسم کے جنگلی نہ ہوں۔ مگر میری مجبور تھی کہ میں تختے پر بیٹھ کر اپنے آپ کو سمندر کے حوالے نہیں کر سکتا تھا اور اس جزیرے پر بھی رہنا مشکل تھا۔ مجھے جیسے بھی ہو جزیرے میں چل کر انسانی آبادی کا کسی طرح سراغ لگانا تھا تاکہ میں ان کی مدد سے کسی ملک کی طرف جا سکوں۔ آخر امریکہ ایسا مہذب ملک وہاں سے اتنی دور بھی نہیں تھا۔ اس اعتبار سے ان جزیروں کو اتنا ویران اور غیر آباد نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ سارا سمندر بحری جہازوں کی گزرگاہ تھا۔ کم از کم جغرافیے کی کتابوں میں میں نے یہی پڑھا تھا۔ گرگٹ نما عفریت کو دیکھ کر میرا جزیرے پر جانے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ میں دیر تک تختے پر بیٹھا رہا۔ جب کافی وقت گزر گیا اور جزیرے کی طرف سے عفریت کی چیخ و پکار نہیں سنائی دی تو میرے اندر حوصلہ پیدا ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ جزیرے کی دوسری طرف چلنا چاہیے۔

میں تختے سے اتر کر جزیرے کے مغربی ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جزیرے کا مغربی ساحل بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ مشرقی ساحل تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس طرف چٹانیں نہیں تھیں۔ میں ڈر کے مارے جزیرے کے درختوں میں نہیں داخل ہوا۔ بس باہر باہر ہی چلتا رہا اور درختوں کو غور سے دیکھتا رہا کہ شاید کہیں کوئی جھونپڑا وغیرہ نظر آ جائے۔ درختوں پر کبھی کبھی کوئی پرندہ بول پڑتا تھا اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ میں کافی دور تک چلتا رہا۔ ایک جگہ یہاں بھی مجھے درختوں میں ایک پگڈنڈی نظر آئی۔ یہ پتلی سی پگڈنڈی تھی اور ساحل سے شروع ہو کر جزیرے کے اندر درختوں میں جا کر گم ہو گئی تھی۔ میں رک کر سوچنے لگا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں؟ کہیں کسی مصیبت میں نہ پڑ

جاؤں۔ مگر اندر جانا بھی ضروری تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور پگڈنڈی پر چل پڑا۔ یہ پگڈنڈی درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی آگے جا کر سمندر کی کھاڑی کے کنارے پر جا کر ختم ہو گئی۔

آگے کھاڑی کا سمندر تھا۔ کشتی بھی کوئی نہیں تھی۔ مجبوراً مجھے واپس ہونا پڑا۔ چونکہ یہاں آتے آتے مجھے کوئی عفریت نہیں ملا تھا اس لئے دل نے کہا کہ اس پگڈنڈی سے ہٹ کر بھی چل کر دیکھو۔ شاید کہیں کسی آبادی کا سراغ مل جائے۔ درخت ناریل کے بھی تھے اور دوسرے اونچے گھنے گنجان درخت بھی تھے جن کے تنوں کے ساتھ جنگلی بیلیں چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک درخت کو دیکھا جس کی شاخوں میں سے گوند جیسی سیال شے نکل نکل کر نیچے بہہ رہی تھی۔ میں مزید آگے گیا تو آگے جنگل اور جھاڑ جھنکاڑ اتنا ہو گیا کہ آگے جانے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ میں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کسی طرف سے ہو کر آگے نکل جاؤں۔

اچانک وہی ڈراؤنی پھنکار اور سسکار اور ڈکار والی بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ عفریت ادھر بھی آ گیا تھا۔ میں بے اختیار پیچھے کو دوڑ پڑا اور اس وقت تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھا جب تک میں سمندر کنارے اپنے تختے پر نہیں پہنچ گیا۔ یہ جزیرہ گرگٹ نما عفریتوں کا جزیرہ تھا۔ ان کے سوا کوئی آبادی نہ تھی۔ اس بات کا مجھے یقین ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے یہ عفریت ان جنگلوں سے باہر نہیں نکلتے تھے ورنہ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے سمندر تک بھی آ سکتے تھے۔ میں واپس اپنے لائف بوٹ یعنی تختے پر آ کر بیٹھ گیا اور جس طرف سے دوڑتا ہوا آیا تھا اس طرف دیکھنے لگا۔ عفریت وہاں نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"بھائی تم یہاں نہیں رہ سکتے۔ اب یہاں سے نکل ہی جاؤ تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ ورنہ انجانے میں کسی عفریت کا لقمہ اجل بن جاؤ گے۔"

سوال یہ تھا کہ وہاں سے واپس کس ذریعہ سے جاؤں اور کس طرف جاؤں۔ میرے پاس صرف ایک ہی تختہ تھا اور اسکا کوئی اعتبار نہیں تھا کہ جس طرف چاہے لے جائے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مجھے سمندر میں تیرتے تیرتے واپس شیطانی جزیرے تک پہنچا دے جہاں سے ہم فرار ہوئے تھے۔ مجھے کرسٹوف اور فلورا کا بھی کسی وقت خیال آ جاتا۔ سوچتا کہ خدا جانے وہ لوگ زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔ اگر زندہ ہیں تو کہاں ہوں گے۔ کس حال میں ہوں گے۔ وہ بھی ضرور کسی ویران جزیرے پر میری طرح پڑے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طوفان کے بعد کسی جہاز نے انہیں اٹھا لیا ہو اور وہ فرنچ گیانا پہنچ گئے ہوں۔ کاش! مجھے بھی کوئی جہاز اٹھا لیتا اور میں اس وقت شہر کی مہذب فضاؤں میں کسی ریستوران میں بیٹھا کافی پی رہا ہوتا۔ مگر میری قسمت میں جو کچھ لکھا تھا وہ پورا ہو رہا تھا۔

کچھ دیر تختے پر بیٹھے رہنے کے بعد مجھے بھوک لگی تو میں ساحل کے ساتھ ہی جو ناریل کے درخت کھڑے سمندر کی ہواؤں میں جھوم رہے تھے وہاں گیا اور نیچے گرے پڑے دو تین تازہ ناریل لے آیا۔ انہیں تختے پر زور زور سے مار کر توڑا۔ ان کا پانی پیا سفید ناریل کھایا اور چپ ہو کر وہیں لیٹ گیا۔ سوچنے لگا کیا کروں؟ یہاں سے کس طرف اور کیسے جاؤں؟ بظاہر کوئی ترکیب نظر نہیں آ رہی تھی۔

آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ بارش کی صورت میں مجھے بھاگ کر چٹان کے اندر ہی پناہ لینے کے لئے جانا پڑتا۔ میں اس طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے گرگٹ نما عفریت کا ڈر تھا کہ کہیں وہ میری بو پا کر وہاں نہ آ جائے۔ لیٹے لیٹے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پھر ایسا ہوا کہ میری آنکھیں نیند نے بند کر دیں۔ میں کافی دیر تک سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو جزیرے پر شام کے سائے اترنا شروع ہو گئے تھے۔ درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ ساحل اسی طرح ویران اور خالی پڑا تھا۔

رات پھر آگئی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ وہاں سوائے ناریلوں کے مجھے اور کچھ نہیں مل رہا تھا۔ دوڑ کر درختوں کے نیچے گیا اور دو تین ناریل اٹھا کر لے آیا۔ ان کا پانی پیا۔ گودا کھا کر بھوک مٹائی اور تختے پر بیٹھا سوچنے لگا کہ اس طرح میں اس جزیرے پر کب تک زندہ رہ سکوں گا۔ آخر میں نے یہی طے کیا کہ کل صبح میں جزیرے کے اندر ٹیلوں کے پیچھے جانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہاں بھی کوئی آبادی نہ ہوئی تو میں اس تختے پر سوار ہو کر جزیرے سے نکل پڑوں گا سمندر پر سکون تھا۔ ہو سکتا ہے سمندر کی موجیں کسی دوسرے جزیرے پر پہنچا دیں جہاں آبادی ہو۔

رات کا اندھرا ہوتے ہی درختوں پر بولنے والے پرندے خاموش ہو گئے۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ صرف سمندری لہروں کی آواز تھی اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں لیٹ گیا اور زبردستی سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔ ایک دھڑکا ضرور دل میں لگا تھا کہ کہیں رات کو کوئی بہت بڑی سمندری لہر آکر تختے کو بہا کر نہ لے جائے۔ ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ مگر ایسا کسی وقت بھی ہو سکتا تھا۔ میں اگلے دن جزیرے کا سروے ضرور کرنا چاہتا تھا۔ عجیب جزیرہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کسی وقت مجھے سمندر کی لہروں سے بھی خوف آنے لگتا تھا۔ اپنے آپ کو حوصلہ دیتا کہ مصیبت آن پڑی ہے تو اس کا ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ کبھی سوچتا کہ نہ جانے لاہور میں اس وقت کیا وقت ہو گا۔ میرے گھر والے کیا کر رہے ہوں گے۔ وہ میرے خط کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ ضرور پریشان ہوں گے۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ میں امریکہ کی رنگینیوں میں کھو کر انہیں بھلا چکا ہوں۔ انہیں کیا معلوم کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ دیکھا جائے تو یہ سب میری ناجائز خواہشات کا نتیجہ تھا۔ نہ مجھے دولت کی ہوس ہوتی اور نہ ہی یہ دن دیکھنا پڑتا۔ امریکہ میں بڑے آرام سے مجھے کوئی جاب مل سکتی تھی۔

اور میں تھوڑی سی کوشش کر کے اپنے گھر والوں کو وہاں بلا سکتا تھا اور یوں کچھ عرصہ چین سے امریکہ میں گزار سکتا تھا۔ لیکن مجھ پر تو دولت حاصل کرنے کا بھوت سوار تھا۔ میں جائز اور ناجائز ہر طریقے سے دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان ہی خیالات میں الجھا میں تختے پر آنکھیں کھولے لیٹا رہا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ لگتا تھا آج کی رات جاگ کر گزارنی پڑے گی۔

خدا جانے کتنی رات گزر چکی تھی کہ مجھے اچانک ایسی آوازیں سنائی دیں کہ جیسے دور کہیں ڈھول تاشے بجنے لگے ہوں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آوازوں پر کان لگا دیئے۔ یہ آوازیں جزیرے کے مغربی ساحل کی جانب جو جنگل تھے' ادھر سے آرہی تھیں۔ اسکا مطلب تھا کہ جزیرے کے مغربی حصے میں لوگ آباد تھے۔ یہ جنگلی ہی ہو سکتے تھے۔ رات کے وقت وہ شاید کوئی مذہبی رسم ادا کر رہے تھے۔ آواز دبی دبی تھی اور برابر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ادھر چل کر دیکھنا چاہیے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بڑے اچھے لوگ ہوں اور ان کے پاس کشتیاں بھی ہوں۔ اور شاید وہ میری مدد کرنے کو بھی تیار ہو جائیں۔ اور مجھے اپنی کشتی میں کسی گائیڈ کے ہمراہ کسی دوسرے آباد جزیرے تک پہنچا دیں جہاں سے مجھے کوئی سٹیمر وغیرہ مل جائے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور جزیرے کے مغربی ساحل کی طرف چلنے لگا۔ اندھیرے میں ہر شے سائے کی طرح نظر آرہی تھی۔ میرے اندر اس جزیرے سے نجات پانے اور کسی مہذب شہر پہنچنے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ میں نے گرگٹ نما عفریتوں کا بھی خیال نہ کیا اور آواز کے تعاقب میں جنگل میں داخل ہو گیا۔

احتیاط کے طور پر میں اس طرف سے داخل نہ ہوا جہاں مجھے رستے میں گرگٹ ملا تھا۔ میں ساحل پر کافی آگے جا کر جنگل میں داخل ہوا تھا۔ میں درختوں کے نیچے بڑی

احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ عفریت کے اچانک کسی طرف سے نکل آنے کا خطرہ ضرور موجود تھا مگر ڈھول کی آواز انسانوں کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی اور انسانوں کی موجودگی نے میرے اندر ایک نئی قوت اور بے خوفی پیدا کر دی تھی۔ آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے اندھیرے میں مجھے درختوں کے پیچھے دور روشنی کی ایک جھلک دکھائی دی اور پھر غائب ہو گئی۔ میں اس طرف چلنے لگا۔ اب آوازیں بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ڈھول بج رہا تھا اور ساتھ ایک اور ساز بھی بج رہا تھا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ کچھ فاصلے پر مجھے وہی روشنی دوبارہ نظر آئی۔

میں اس طرف بڑھا۔

کوئی سو پچاس گز چلنے کے بعد میں گھنے درختوں کے نیچے اونچی جھاڑیوں کی ایک دیوار کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ کیونکہ اس کی دوسری جانب مجھے مشعلوں کی روشنی میں کچھ آدمی عجیب طرح سے ڈانس کرتے نظر آئے۔ انہوں نے درمیان میں الاؤ روشن کر رکھا تھا۔ میں دبے دبے قدم اٹھاتا جھاڑیوں کے بالکل قریب چلا گیا۔ میں نے جھاڑیوں کی تھوڑی سی شاخیں ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ آگ کا الاؤ روشن تھا۔ نیم عریاں جنگلی قسم کے لوگ جن کے سروں پر درختوں کی ٹہنیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے چھرے تھے۔ تھرک تھرک کر ناچ رہے تھے اور بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کر حلق سے عجیب قسم کی آوازیں نکال رہے تھے۔ آلاؤ کے ایک جانب ایک درخت کے پاس دو جنگلی خاموش کھڑے تھے۔ دو آدمی نیچے بیٹھے تھے۔ ایک ڈھول بجا رہا تھا دوسرا منہ کے ساتھ لگا کر کوئی ساز بجا رہا تھا جس میں سے بانسری کی آواز نکلتی تھی۔ یہ لوگ جنگلی اور وحشی تھے۔ میں سخت مایوس ہوا۔ مجھے ان لوگوں سے مدد کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ میں نے دل میں سوچا۔

بہت ممکن ہیں کہ یہ آدم خور ہوں اور مجھے اپنے پاس دیکھ کر دبوچ لیں۔ دل نے کہا۔ میاں خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے واپس ہو جاؤ اور راتوں رات اس جزیرے سے نکل جاؤ۔ اگر ان لوگوں کو تمہارا پتہ چل گیا تو تمہاری خیر نہیں۔ میں واپس ہونے ہی لگا تھا کہ میں نے دیکھا کہ الاؤ کی روشنی میں کچھ آدمی ایک عورت اور ایک آدمی کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لئے آ رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں رسیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جب یہ دونوں الاؤ کی روشنی میں قریب آئے تو میں ششدر ہو کر رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ جن لوگوں کو یہ جنگلی کھینچتے ہوئے لا رہے تھے ان میں ایک فلورا اور ایک کرسٹوف تھا۔ یا خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ چہروں پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ فلورا کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بے بسی کے عالم میں اپنا سر دائیں بائیں مار رہی تھی۔ کرسٹوف کا چہرہ ساکت تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پتھر بن چکا ہو۔ دو جنگلیوں نے انہیں ایک ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس نے چھری کی نوک کو باری باری فلورا اور کرسٹوف کے ماتھے پر لگایا اور پیچھے ہٹ کر ایک چیخ ماری۔ اس چیخ کے ساتھ ہی ڈھول کی آواز تیز ہو گئی اور وہ سارے جنگلی عجیب وحشیانہ انداز میں الاؤ کے گرد رقص کرنے لگے۔ کیا یہ لوگ فلورا اور کرسٹوف کو ہلاک کرنے والے ہیں؟ کیا یہ انہیں بھون کر کھا جائیں گے۔ یہ سوچ کر میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی مدد کرنے کا مطلب تھا کہ میں بھی ان کے ہاتھ آ جاؤں اور ان دونوں کے ساتھ ہی ہلاک کر دیا جاؤں۔ میرے پاس اگر اس وقت سٹین گن ہوتی تو میں فائر کر کے ان سب کو بھون سکتا تھا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑا سکتا تھا۔ مگر میرے پاس تو پنسل بنانے والا چاقو بھی نہیں تھا۔

اس وقت مجھ پر خود غرضی غالب آگئی۔ مجھے اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی۔ میں وہاں سے واپس بھاگنے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ جنگلی وہاں سے جانے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ دو جنگلیوں کے علاوہ سارے جنگلی چلے گئے۔ انہوں نے الاؤ میں لکڑی کے بڑے بڑے مڈھ ڈالے اور درخت کے ساتھ بندھے ہوئے فلورا اور کرسٹوف کے گرد ڈانس کرتے ہوئے تین چکر لگائے اور اسی طرح ڈانس کرتے اور اونچی آواز میں گاتے، جس طرف جنگلی گئے تھے، اسی طرف چلے گئے۔ اب میدان خالی تھا۔ الاؤ کی آگ نئی لکڑیاں ڈالنے سے بھڑک اٹھی تھی۔ فلورا اور کرسٹوف بے بسی کے عالم میں درخت سے بندھے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے جسم کو ہلا جلا کر رسیوں کی قید سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر رسیاں پیچھے اس طرح بندھی ہوئی تھیں کہ وہ زیادہ ہل جل بھی نہیں سکتے تھے۔

میرا خود غرضی اور اپنی جان بچانے کا جذبہ غائب ہو گیا اور فلورا کی محبت پھر سے بیدار ہو گئی۔ میں نے ان دونوں کو وہاں سے نکال لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے کان جنگلی لوگوں کی آوازوں پر لگے تھے جو آہستہ آہستہ جزیرے کے مغرب کی جانب جنگل میں مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔ جب یہ آوازیں بالکل غائب ہو گئیں تو میں ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر جھاڑیوں سے نکل کر سیدھا فلورا اور کرسٹوف کے پاس پہنچ گیا اور انہیں آہستہ سے کہا۔

"حیران مت ہونا۔ خاموش رہنا۔ میں تمہاری مدد کو آگیا ہوں۔"

میری آواز سن کر فلورا نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ کرسٹوف مجھے دیکھ کر پہلے ہی حیران اور خوش ہو رہا تھا۔ فلورا کا مرجھایا ہوا چہرہ تھوڑا کھل اٹھا۔ میں نے جلدی جلدی پیچھے سے ان کے بازوؤں اور ہاتھوں کو رسیوں کی گانٹھوں سے آزاد کیا اور کہا۔

"میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

فلورا اور کرسٹوف میرے پیچھے پیچھے تیز تیز آئے میں جھاڑیوں میں سے انہیں لے کر جنگل کے اونچے اونچے درختوں کے اندھیرے میں آگیا۔ میں نے ان سے کہا۔

"رکنا بالکل نہیں۔ چلتے آؤ"

فلورا بولی۔ "تھینک گاڈ۔ تھینک گاڈ" کرسٹوف کچھ کہنے لگا تو میں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"تم لوگ چپ نہیں رہ سکتے؟"

ہم درختوں میں سے تیز تیز چلتے ساحل سمندر پر آگئے۔ اندھیرے میں ریت پر اس طرف بھاگ رہا تھا جہاں سمندر کے کنارے تختہ پڑا تھا۔ فلورا اور کرسٹوف دونوں میرے پیچھے پیچھے بھاگتے چلے آرہے تھے۔ تختے پر چڑھ کر میں نے انہیں کہا۔

"جلدی سے اوپر آجاؤ۔ ہمیں ابھی یہاں سے نکل جانا ہو گا۔"

میں تختے سے نیچے آگیا۔ کیونکہ سمندر کی لہریں تختے سے کچھ فاصلے پر آکر واپس چلی جاتی تھیں۔ میں نے کرسٹوف سے کہا۔

"نیچے آجاؤ۔ ہمیں اس تختے کو کھینچ کر سمندر میں لے جانا ہو گا۔"

میں اور کرسٹوف مل کر تختے کی رسیوں کو پکڑ کر اسے سمندر کی طرف کھینچنے لگے۔ فلورا تختے پر دونوں گھٹنے سینے سے لگائے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم تختے کو سمندر میں اس جگہ پر لے جانے میں کامیاب ہو گئے جہاں سمندر کی موجیں پوری طرح پہنچ رہی تھیں۔ ایک بڑی لہر آرہی تھی۔ میں اور کرسٹوف اچھل کر تختے پر چڑھ گئے۔ سمندر کی لہر نے تختے کو اوپر اٹھایا ذرا آگے ساحل کی طرف لے گئی اور واپس جاتے ہوئے اپنے ساتھ ہمارے تختے کو بھی سمندر میں پہنچا دیا۔ ہمارا تختہ سمندر کی لہروں پر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہم دونوں جانب اوندھے منہ لیٹ گئے

تھے اور بازوؤں کو چپو کی طرح آگے کو چلا رہے تھے تاکہ تختہ جتنی جلدی سمندر میں آگے جاسکتا ہے چلا جائے۔

جب تختہ سمندر میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے مجھے یقین تھا کہ واپس ساحل کی طرف نہیں جائے گا تو میں نے کرسٹوف سے کہا۔

"آجاؤ۔ اب معاملہ ٹھیک ہے۔"

ہم تینوں تختے کے درمیان ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کرسٹوف کہنے لگا۔

"تم تو رحمت کا فرشتہ بن کر اس وقت آگئے ہو سلمان۔ یہ جنگلی صبح سورج کے نکلنے کے وقت ہم دونوں کو آگ میں زندہ جلانے والے تھے۔"

میں نے فلورا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ مجھے زندہ سلامت مل گئے"

فلورا کہنے لگی۔

"سلمان! تم نے مجھے پھر سے زندگی دی ہے میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں اتار سکوں گی۔"

میں نے کرسٹوف کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"میں اپنی کہانی تو بعد میں سناؤں گا پہلے تم لوگ مجھے بتاؤ کہ سمندر میں جب طوفان آیا تھا اور جہاز ڈوب گیا تھا تو تمہارے ساتھ کیا گزری؟

کرسٹوف نے کہا۔

"جب طوفان آیا تو میرا ڈرم بھی لڑھکتا ہوا سمندر میں گر گیا۔ میں نے پاؤں مار مار کر ڈرم کا ڈھکن کھول دیا اور ڈرم سے باہر طوفانی سمندر میں نکل آیا۔ اس وقت مجھے بارش اور اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا خیال تمہاری طرف اور فلورا کی طرف چلا گیا کہ خدا جانے تم دونوں ڈرموں میں سے نکل سکے ہو یا نہیں۔ ڈرم میں پانی

بھر گیا تھا۔ مگر چونکہ وہ لکڑی کا تھا اور بڑا ڈرم تھا اس لئے نہیں ڈوبا تھا بلکہ موجوں پر اچھل رہا تھا۔ میں نے اس کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ طوفانی موجیں مجھے ادھر سے ادھر اچھال رہی تھیں۔ ڈرم میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے اندھا دھند تیرنا شروع کر دیا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا تھا۔ پہاڑ ایسی بڑی موجیں مجھے اٹھا اٹھا کر دور پھینک رہی تھیں۔ ایک بار مجھے سمندر کی اونچی لہر نے اچھال کر دوسری طرف پھینکا تو مجھے ایک اور ڈرم اندھیرے میں دکھائی دیا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس میں سے مجھے ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دی۔ کوئی اندر سے اس کے ڈھکن کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک میرا خیال فلورا کی طرف چلا گیا۔ یقیناً اندر فلورا ہے۔ میں نے باہر سے ڈھکن کے کیل اکھاڑنے شروع کر دیئے اور ڈھکن کھلنے پر فلورا کو اندر سے باہر نکالا۔ ڈرم میں پانی بھر چکا تھا میں نے فلورا کا سر اونچا کئے رکھا اور اسے چیخ کر کہا کہ وہ ہمت سے کام لے اور میرے ساتھ تیرتی رہے۔ میری آواز نے فلورا کو حوصلہ دیا اور وہ میرے ساتھ تیرنے لگی۔ ہم تیرتے تیرتے سمندر میں کافی آگے نکل گئے۔ تیرنا کیا تھا بس طوفانی موجیں ہمیں ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف لئے جا رہی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ چاروں طرف بارش' اندھیرا اور چیختی ہوائیں تھیں۔ پھر بھی ہم نے حوصلہ نہ ہارا۔ نہ جانے ہم کتنی دیر تک سمندر میں ہاتھ پاؤں چلاتے رہے کہ بارش یکدم سے رک گئی۔ طوفان کا زور کم ہونے لگا۔ بارش کی دھند کم ہونے سے میں نے اندھیرے میں لکڑی کا تختہ پانی میں اوپر نیچے ہوتے دیکھا۔ میں نے فلورا کو وہ تختہ دکھایا اور ہم دونوں اس کی طرف بڑھے۔ یہ لکڑی کا ایک بڑا میز تھا۔ ہم اچک کر اس کے اوپر چڑھ کر نیم جان ہو کر لیٹ گئے۔ ساری رات اس پر بے سدھ ہو کر گزاری۔ دن کی روشنی کم ہوئی تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور شکر کیا کہ ہم زندہ تھے۔ میں نے فلورا سے کہا کہ وہ

گھبرائے نہیں۔ اس علاقے میں چھوٹے چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ سمندر کی موجیں ہمیں کسی نہ کسی جزیرے تک پہنچادیں گی۔ جہاز ڈوب چکا تھا۔ اسکا نام و نشان تک کہیں نہیں نظر آرہا تھا۔ طوفان تھم چکا تھا۔ سمندر کی لہریں کافی حد تک پرسکون ہو چکی تھیں۔ اتنے میں ہمیں کچھ فاصلے پر دو تین کشتیاں دکھائی دیں۔ میں نے فلورا سے کہا کہ یہ ساحلی جزیرے کے کوسٹ گارڈ ہوں گے۔ جہاز کے کپتان نے جہاز ڈوبتا دیکھ کر ایس او ایس کا سگنل دیا ہوگا اور یہ لوگ ہمیں بچانے کے لئے آرہے ہوں گے۔ ہم زور زور سے بازو ہلانے لگے۔ کشتیاں قریب آئیں تو کشتیوں میں کوسٹ گارڈز کی جگہ وہ جنگلی سوار تھے جن کی قید سے تم ہمیں چھڑا کر لائے ہو۔ پھر بھی مجھے امید تھی کہ یہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ کیونکہ یہ سمندر دنیا کے دو تین مہذب اور ترقی یافتہ ممالک کا سمندر ہے اور یہاں جزیروں پر رہنے والے لوگ اتنے وحشی اور جنگلی نہیں ہوتے۔ ان لوگوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ قریب آکر انہوں نے اٹھا کر ہمیں کشتی میں ڈال لیا اور اپنے جزیرے پر لے آئے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم برٹش گیانا جارہے تھے ہمارا جہاز ڈوب گیا ہے۔ وہ گھور گھور کر ہمیں دیکھتے تھے اور آپس میں عجیب و غریب زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ایک آدمی نے ہماری طرف مسکرا کر دیکھا اور اشاروں سے ہمیں تسلی دی۔ انہوں نے ہمیں اپنی ایک جھونپڑی میں بند کر دیا۔ ہمارے پاؤں میں رسیاں باندھ دیں۔ رسیاں اس طریقے سے باندھیں کہ ہم چل سکتے تھے مگر دوڑ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کھانا اور پھل کھلائے اور رات کو ہماری جھونپڑی کے باہر پہرہ لگادیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی مذہبی رسم ادا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بہت جلد مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ لوگ ہمیں یا تو زندہ بھون کر کھانے کی تیاریاں کر رہے تھے یا پھر ہمیں کسی دیوتا کے آگے قربان کرنے والے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ ان سمندروں میں

جو وحشی لوگ ہیں وہ سورج دیوتا کی پوجا کرتے ہیں اور اگر کوئی اجنبی ان کے ہاتھ آ جائے تو اسے سورج دیوتا پر قربان کر دیتے ہیں۔ ایک رات انہوں نے مجھے اور فلورا کو ایک ہی جھونپڑے میں رکھا۔ دوسرے دن ہمیں الگ کر دیا۔ فلورا کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ اب اس کی زندگی کے کچھ ہی گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ کیوں فلورا؟"

فلورا نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو کرسٹوف۔ میں اپنی زندگی سے ناامید ہو چکی تھی"

کرسٹوف کہنے لگا:

"یہ جنگلی لوگ صبح ہی سے اپنے چھروں کو تیز کرنے اور ان کی نمائش کرنے لگے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم عین موقع پر آگئے اور ہم اس وقت زندہ ہیں۔"

فلورا میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ سمندر کی رات پرسکون تھی اور ہمارا تختہ لہروں پر اپنے آپ ایک طرف بہتا جارہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے پیار سے دباتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کیسے پہنچے؟"

کرسٹوف بولا۔

"اب تم اپنی داستان سناؤ کہ تمہارے ساتھ جہاز ڈوبنے کے بعد کیا گزری؟"

اب میری باری تھی۔ میں نے بھی انہیں پوری کہانی سنائی کہ کس طرح میں ڈرم سے باہر نکلا۔ کس طرح سمندر میں رات گزارنے کے بعد اس جزیرے پر پہنچا۔ میں نے انہیں گرگٹ نما عفریت کے بارے میں بھی بتایا۔ عفریت کا سن کر فلورا سہم کر میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے کہا۔

"میں تو وہاں سے واپس جانے والا تھا کہ تم لوگوں کو آتے دیکھ لیا۔ میں تو حیران رہ گیا کہ ہماری ملاقات کس ڈرامائی انداز سے ہو رہی تھی۔"

فلورا کہنے لگی۔

"اب ہم کتنی دیر تک سمندر میں رہ سکیں گے۔ ہمیں یہ سوچنا ہو گا کیونکہ ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ نہیں ہے۔"

میں نے انہیں تین ناریل دکھائے جنہیں میں نے رسیوں کے ایک گچھے میں لپیٹ کر تختے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ کرسٹوف بولا۔

"یہ تین ناریل زیادہ دن نہیں چل سکیں گے۔ دن نکلنے پر کچھ پتہ چل سکے گا کہ ہم کس سمت میں جا رہے ہیں۔ خدا کرے کہ سورج نکل آئے۔ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے' یہ سارا علاقہ چھوٹے چھوٹے جزیروں سے بھرا ہوا ہے۔ میں حیران ہوں سلمان کہ تمہیں طوفانی موجیں کہاں سے کہاں لے گئی تھیں کہ تم ایک رات اور ایک دن کا سفر کرنے کے بعد جزیرے پر پہنچے۔"

فلورا نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا نہ کرے ہم پھر ایسے کسی جزیرے پر پہنچ جائیں جہاں آدم خور وحشی رہتے ہوں۔"

کرسٹوف بولا۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ کل تک ہم کسی نہ کسی جزیرے پر ضرور پہنچ جائیں گے۔"

رات اسی طرح باتیں کرتے گزر گئی۔ کچھ سوتے گزر گئی۔ قسمت ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ دوسرے دن سورج نکل آیا۔ سورج کو دیکھ کر کرسٹوف کہنے لگا۔

"ہم مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔ مغرب کی طرف کرپٹن کا سمندر ہے اور وہاں جزیروں کے جھرمٹ بھی ہیں اور وسطی امریکہ کی پٹی کا ساحل بھی ہے۔"

کرسٹوف کی باتوں نے ہمارے اندر ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا۔ ہم نے پھر بھی احتیاط کے طور پر صرف ایک ناریل توڑ کر تینوں نے اسکا دو دو تین تین گھونٹ پانی پیا اور گری کھائی۔ سورج جیسے جیسے اوپر آ رہا تھا اس کی چمک اور گرمی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چمک سمندر کے پانی کی تھی جو ناقابل برداشت تھی۔ فلورا آنکھیں بند کر کے تختے پر لیٹ گئی۔ دھوپ بہت جلد ہمیں پریشان کرنے لگی تھی۔ اسکا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں تھا سوائے اسکے کہ ہم اپنی قمیضیں جو پھٹی ہوئی تھیں سمندر کے پانی میں گیلی کر کے پہن لیتے۔ اس سے ایک اور عذاب میں مبتلا ہو گئے کیونکہ سمندر کے پانی میں نمک بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جب میں نے اور کرسٹوف نے اس طرح کیا تو ہمیں کچھ دیر تو بڑا سکون ملا پھر اچانک ہمارے بدن میں کانٹے چبھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ سمندر کے پانی کے ساتھ اسکا نمک بھی ہمارے جسموں کے ساتھ چپک گیا تھا اور بدن خشک ہو جانے پر اب اسکے نوکیلے ذرے جسم کو چبھ رہے تھے۔ فلورا اس اذیت سے بچ گئی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی چیتھڑے بنی قمیض نہیں اتاری تھی۔ ہم نے خشک قمیضوں سے اپنے جسموں کو رگڑ رگڑ کر خشک نمک اتارا تو کچھ افاقہ ہوا۔ دوپہر کو بھی ہم نے ایک ناریل توڑ کر اسکا پانی پیا اور گودا کھایا۔ اب ہمارے پاس صرف ایک ہی ناریل باقی رہ گیا تھا۔ اس کے بعد ہمارا اللہ ہی حافظ تھا۔ مجھے اس سوچ سے خوف آنے لگا تھا کہ خوراک اور پانی ختم ہونے کے بعد کیا ہو گا۔ میں نے کرسٹوف سے کہا۔

"کرسٹوف! کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم کل تک کسی جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

کرسٹوف بڑا پر اعتماد تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے پورا یقین ہے۔ میں اس سارے علاقے کا جغرافیہ جانتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اور اگر خدا نہ کرے شیطانی حوں نے ہمیں واپس اس جزیرے پر پہنچادیا تو کیا ہو گا۔؟"

کرسٹوف نے نفی میں سرہلاتے ہوئے سورج کی طرف ایک سرسری نگاہ ڈالی اور بولا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہم شمال مغرب کی طرف جارہے ہیں اور ڈیول آئی لینڈ ہمارے جنوب مشرق کی طرف پیچھے رہ گیا ہے۔"

کرسٹوف کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ دوپہر کے وقت ہمیں اپنے عقب میں ایک سیاہ دھبہ دکھائی دیا۔ اس پر سب سے پہلے فلورا کی نظر پڑی۔ اس نے ہمیں وہ دھبہ دکھایا اور بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

"ہم ایک جزیرہ اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ دیکھو جزیرے کے درختوں کی سیاہی صاف نظر آرہی ہے۔"

ہم اس دھبے کو غور سے دیکھنے لگے۔ کرسٹوف بے چین ہو کر بولا۔

"تختے کو بائیں طرف چلانے کی کوشش کرو۔ جس دھبے کو تم جزیرہ سمجھ رہی ہو وہ کوئی سمندری جہاز ہے جو ہماری سمت میں آرہا ہے۔"

ان الفاظ نے گویا ہمارے جسموں میں جان ڈال دی۔ میں نے کہا۔

"کرسٹوف کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

اسکی نگاہیں سیاہ دھبے پر لگی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا۔ "میری نظریں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ ہم اس طرف سے گزر کر آرہے ہیں۔ اگر یہ کوئی جزیرہ ہوتا تو ہمیں ضرور نظر آجاتا۔ یہ کوئی جہاز ہے جو اس وقت سمندر کی گولائی یعنی قوس میں چھپا ہوا تھا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہر پچیس تیس میل کے بعد ہماری گول زمیں خم کھاجاتی ہے۔"

ہم تینوں کی نگاہیں سیاہ دھبے پر جم گئیں جو واقعی آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جارہا تھا جبکہ ہم اس کے مخالف سمت جارہے تھے۔ ہم کوشش کر کے اپنے تختے کو سمندر کی بائیں جانب جتنا لا سکتے تھے لے آئے۔ آہستہ آہستہ دھبا مخروطی شکل اختیار کر گیا۔ پھر ہمیں اس کی اونچی چمنی نظر آنے لگی جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ ہمارے ناچنے سے تختہ ڈولنے لگا۔ فلورا جلدی سے بیٹھ گئی۔

کرسٹوف نے کہا۔

"ہمیں ہوش میں رہنا چاہیے۔ یہ کوئلے سے چلنے والا سٹیم شپ ہے۔ ضرور یہ مال بردار جہاز ہے۔"

میں نے کہا۔ "کہیں یہ ڈیول آئی لینڈ والوں کا جہاز نہ ہو۔ میرا مطلب ہے یہ اگر فرنچ گیانا کی حکومت کا جہاز ہوا تو وہ ہمیں گرفتار کر لیں گے۔ ہمارے فرار کی خبر تو ریڈیو ٹیلی ویژن پر سارے ملکوں میں نشر ہو چکی ہو گی۔"

کرسٹوف بولا۔

"اب یہ ہماری قسمت ہے۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال ہمیں جہاز والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو گا۔"

میں نے اور کرسٹوف نے اپنی پھٹی ہوئی قمیضیں اور انہیں ہاتھ سے پکڑ کر زور زور سے لہرانے لگے۔ جہاز اب دور سے صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا۔

"جہاز کو قریب تو آنے دو"

وہ بولا۔

"خدا کے لئے قمیض لہراتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جہاز کچھ فاصلے پر سے دوسرے طرف نکل جائے۔"

ہم دیوانہ وار قمیض پکڑ کر لہرانے لگتے۔ جہاز ہمیں واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اسکارنگ سرخ اور سیاہ تھا۔ شاید جہاز کے کپتان نے دور بین سے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ جہاز کا سائرن اچانک بجنے لگا۔ کرسٹوف نے خوشی سے چیخ مار کر کہا۔

"انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ اوہ میرے خدایا انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

جہاز نے ایک خاص زاویہ بدل لیا اور اس کا رخ سیدھا ہمارے تختے کی جانب ہو گیا تھا۔ جہاز ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ کرسٹوف نے ہم دونوں سے کہا۔

"ہم تینوں کو ایک ہی کہانی بیان کرنا ہوگی۔ کہانی یہ ہے۔ ہم امریکی سیاح ہیں۔ ہم امریکی نیشنل ہیں۔ ہم سری نام کی بندرگاہ پرامبو سے ایک جہاز پر سوار ہو کر جمیکا کے جزیرے باربیدوس جا رہے تھے کہ جہاز طوفان میں پھنس کر ڈوب گیا۔ ہم جاں بچا کر بڑی مشکل سے ایک تختے پر بیٹھ گئے۔ یہ تختہ ہمیں ایک جزیرے میں لے گیا جہاں ہمیں جنگلی لوگوں نے پکڑ لیا۔ وہاں سے ہمیں رات کے وقت اسی تختہ پر جان بچا کر فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ بس اس سے آگے کوئی بات نہیں کہنی ہمارے پاسپورٹ اور سامان اور سارے کاغذات وغیرہ جہاز کے ساتھ ہی ڈوب گئے تھے۔ اب ہمیں واپس امریکہ جانا ہے۔ اس کہانی کو ذہن میں اچھی طرح بٹھالو۔"

جہاز ہمارے تختے سے دور سمندر میں رک گیا۔ جہاز پر ہمیں کالی رنگت والے نیگرو سفید اور نیلی وردیوں میں ملبوس ڈیک کے جنگلے پر کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے وہ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاز پر سے ایک لمبی کشتی سمندر میں اتاری گئی جس میں دو نیگرو بیٹھے اسے چلاتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ قریب آ کر انھوں نے ہمیں کشتی پر بٹھایا اور واپس جہاز کی طرف چل پڑے۔ وہ انگریزی میں ہم سے سوالات کرنے لگے۔ ہم نے ان سب کے سوالوں کے جواب میں یہی کہا۔

"ہمارا جہاز ڈوب گیا تھا۔ ہم سخت تھکے ہوئے ہیں۔ ہم بھوکے ہیں۔"

ہمیں جہاز پر کھینچ لیا گیا۔ ہمارے اوپر کمبل ڈال کر ہمیں سٹریچروں پر ڈال کر نیچے چھوٹے سے ہسپتال کیئر کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک کالے ڈاکٹر نے ہمارا بلڈ پریشر دیکھا۔ ٹمپریچر دیکھا۔ ہمیں دوائی پلائی اور گلوکوز لگا دیا۔ پھر ہمیں کھانے کو چوزوں کا شوربہ اور پتلی ڈبل روٹی دی گئی جسے ہم فوراً نگل گئے۔ اس کے بعد ہمیں نیند آ گئی۔ ہمارے سٹریچر کمرے میں ساتھ ساتھ ہی تھے۔

جب نیند سے بیدار ہوئے تو نیگرو ڈاکٹر نے ہماری نبض چیک کی اور انگریزی میں کہا۔

"اب تم لوگ بالکل ٹھیک ہو۔ تم خوش قسمت ہو کہ ہمارے جہاز کے سیلرز نے تمہیں دیکھ لیا۔"

ہم نے گرم پانی میں غسل کیا۔ نیلے رنگ کے سلیپنگ سوٹ ٹائپ کے پاجامے اور کالروں والے کرتے پہن لئے۔ ایک نیگرو نے ڈاکٹر کے کان میں آ کر کچھ کہا۔ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"تم بستروں پر لیٹ جاؤ۔ جہاز کا کیپٹن تم سے ملاقات کرنے آ رہا ہے۔"

ہم تینوں اپنے اپنے سٹریچر نما بستروں پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک بھاری بھرکم مضبوط گردن اور کرخت چہرے والا نیگرو آدمی کیپٹن کی وردی میں کمرے میں داخل ہوا۔ دو محافظ اس کے ساتھ تھے۔ اس کی وردی بھی نیلی تھی۔ سر پر نیلی کیپ تھی۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ ہم بستروں پر سے اٹھنے لگے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں منع کیا اور ہمارے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے ہم تینوں کو باری باری تیز نظروں سے دیکھا۔ پھر کرسٹوف کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"تم کس جہاز میں سفر کر رہے تھے؟"

کرسٹوف ہم سب سے سیانا اور ہوشیار آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ شاید کپتان کے دماغ میں وہ جہاز ہو گا جو ڈیول آئی لینڈ سے شراب لے کر آرہا تھا اور ڈوب گیا ظاہر ہے اس کی خبر بھی چھپ چکی ہو گی اور یہ خبر بھی کپتان نے ریڈیو پر شاید سن لی ہو کہ ڈیول آئی لینڈ سے تین قیدی بھاگ گئے ہیں۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ بڑی اچھی انگریزی میں کہا۔

"ہمارے جہاز کا نام ہیرلڈ تھا اور یہ پارا جو سے قریبی جزائر کی سیر و سیاحت کے لئے سیاحوں کو لے جا رہا تھا۔ طوفان میں پھنس کر جہاز ڈوب گیا۔ یہ چھوٹا جہاز تھا اور ہمارے علاوہ اس میں سپین اور پرتگال کے کچھ ٹورسٹ بھی سوار تھے۔"

میں نے محسوس کیا جہاز کا کپتان مشکوک نظروں سے کرسٹوف کی کہانی سن رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے کرسٹوف نے بھی محسوس کیا ہو۔ اس کے بعد کپتان میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم امریکی نہیں ہو۔ کیا تم انڈیا کے باشندے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جی نہیں۔ میں پاکستان میں پیدا ہوا تھا مگر امریکی نیشنل ہوں اور واشنگٹن میں ایک ریستوران میں کام کرتا ہوں"

اس نے فلورا سے بھی دو چار باتیں کہیں۔ ہم سب نے وہی کہانی دہرائی جو کرسٹوف نے ہمیں طوطے کی طرح رٹا دی ہوئی تھی۔ کپتان ہم سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

شام کو اس نے ہمیں اپنے کیبن میں بلایا۔ میز پر کافی کے مگ رکھے تھے۔ کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں تم تینوں میرے ساتھ کافی پیو۔"

ہم بڑے محتاط ہو کر بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کپتان نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے یہ خبر سنی تھی کہ ڈیول آئی لینڈ سے تین قیدی فرار ہو گئے ہیں اور جس جہاز میں شبہ ہے کہ وہ فرار ہوئے تھے وہ ڈوب گیا ہے؟"

ہم ایکدم چونک سے پڑے۔ مگر اپنے چہروں سے ہم نے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ کرسٹوف بولا۔

"ہم نے ایسی کوئی خبر نہیں سنی"

کپتان بولا۔

"میں نے ریڈیو پر نشر ہونے والی وہ خبر ریکارڈ کر لی تھی۔ اسے فرنچ گیانا کے ریڈیو نے انگریزی اور فرنچ دونوں بلیٹن میں نشر کیا تھا۔ تم سن سکتے ہو۔"

اس نے ہاتھ پیچھے کر کے شیلف پر رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو آن کر دیا۔ ریکارڈ کی ہوئی خبر دوبارہ سنائی گئی۔ اس خبر میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ تین قیدی ڈیول آئی لینڈ سے فرار ہو گئے ہیں خیال ہے کہ وہ جس مال بردار جہاز میں سوار ہو کر فرار ہوئے ہیں وہ جہاز طوفان میں پھنس کر ڈوب گیا ہے۔ ان قیدیوں میں سے ایک عورت کا نام فلورا ہے جو امریکی ہے۔ ایک قیدی کا نام کرسٹوف ہے جو فرانسیسی جرنلسٹ رائیٹر ہے اور ایک قیدی پاکستانی ہے۔ اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔"

کیپٹن نے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا۔

وہ آگے کو جھک کر بولا۔

"کیا اب بھی تمہیں کوئی شبہ ہے کہ تم وہ قیدی نہیں ہو ہمیرا خیال ہے اب شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ کیا خیال ہے؟"

ہم لاجواب ہو چکے تھے۔ ہمارے مفرور قیدی ہونے کا بولتا ہوا ثبوت کیپٹن نے پیش کر دیا تھا۔ کرسٹوف کہنے لگا۔

"سر! ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم ہی ڈیول آئی لینڈ کے مفرور قیدی ہیں اور جس جہاز میں چھپ کر ہم سفر کر رہے تھے وہ ڈوب گیا تھا لیکن ہم جان بچا کر ایک تختے پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرانس کی حکومت نے مجھے ڈیول آئی لینڈ جلاوطن کر دیا۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے میری گرل فرینڈ فلورا اور میرے پاکستانی دوست کو بھی پکڑ لیا اور انہیں بھی ڈیول آئی لینڈ پہنچا دیا۔ ہم قاتل ہیں نہ ڈاکو' نہ جرائم پیشہ۔ ہم پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ ہمیں فرنچ گیانا پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔ ہم آپ کے جہاز پر ڈیک صاف کرنے اور برتن دھونے کا کام کر سکتے ہیں۔ بے شک آپ ہمیں اپنے ہاں نوکر رکھ لیں۔۔۔"

جہاز کا کرخت چہرے والا نیگرو کپتان بڑے غور گفتگو سن رہا تھا۔ اس دوران اس نے میری طرف اور فلورا کی طرف بھی دیکھا تھا۔ جب کرسٹوف نے بات ختم کی تو کیپٹن نے کافی کی پیالی میں سے ایک گھونٹ پیا اور سگار کا کش لے کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کرسٹوف کی طرف متوجہ ہوا۔

"اگر ہم نے تمہیں جہاز پر پناہ دی تو یہ خبر چھپی نہیں رہے گی۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں نے ڈیول آئی لینڈ کے قیدیوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ میں ایک تجارتی جہاز کی کمپنی کا ملازم ہوں اور جنوبی امریکہ کی بندرگاہوں کے درمیان جہاز رانی کرتا ہوں۔ میری جہاز راں تجارتی کمپنی تک یہ خبر پہنچی تو اسی وقت مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا۔ میری کمپنی ایک کمرشل فرم ہے۔ وہ کسی بھی حکومت کے ساتھ تعلقات خراب کر کے اپنے کاروبار کو نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے مجبور ہوں مجھے تم تینوں کو فرنچ گیانا کی حکومت کے حوالے کرنا ہو گا۔"

ہم پریشان ہو گئے۔ اس سے تو سمندر میں بھٹکتے رہتے تو اچھا تھا۔ کرسٹوف نے کہا۔

"کیپٹن! اگر آپ نے ہمیں فرنچ گیانا پولیس کے حوالے کر دیا تو وہ فوراً ہمیں ڈیول آئی لینڈ پہنچا دے گی اور وہاں پہنچتے ہی شیطانی جزیرے کا وارڈن وہاں کے قانون کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہمیں فوراً شوٹ کر کے ہماری لاشیں سمندری شارکوں کے آگے ڈال دے گا۔"

نیگرو کیپٹن نے بھاری بھرکم کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سوری! میرے پاس دوسرا راستہ کوئی نہیں ہے۔"

کرسٹوف اس نیگرو کپتان کی نفسیات کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

"کیپٹن! آپ کا بحری جہاز مال لے کر جزائر بہاماز کے جزیرے ناساؤ جا رہا ہے کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں۔" کیپٹن نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کرسٹوف بولا۔

"کیپٹن بہاماز کے اس جزیرے سے امریکی ریاست فلوریڈا زیادہ دور نہیں ہے۔ درمیان میں خلیج فلوریڈا کا سمندر حائل ہے جس کا فاصلہ سو ڈیڑھ سو میل ہو گا۔ اگر آپ ذمہ لیں کہ ہم تینوں کو اپنی حفاظت میں فلوریڈا پہنچا دیں گے تو مجھے بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

نیگرو کیپٹن مکاری سے مسکرایا۔ سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"تم کیا دے سکتے ہو؟ میں اس جہاز کا کیپٹن ہوں۔ اگر کسی کو علم ہو گیا تو میری شہرت کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتاؤ کہ تم مجھے کیا پیش کر سکتے ہو؟"

کرسٹوف نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا۔ اور پھر بولا۔

"میں تمہاری خدمت میں ایک لاکھ فرانسیسی فرانک پیش کر سکتا ہوں۔"

ایک لاکھ فرانک کافی بڑی رقم تھی۔ شاید نیگرو کپتان کو اتنی بڑی رقم کی توقع نہیں تھی۔ اس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ معاملہ طے سمجھو۔ مگر یہ رقم تمہیں مجھے پیشگی ادا کرنی ہوگی۔ تم اسکا کیسے انتظام کرو گے؟"

کرسٹوف نے کہا۔

"پیرس میں میرے بھائی کا بہت بڑا بزنس ہے۔ میں اس کے نام تمہارے آدمی کو خط بھی دے سکتا ہوں اور فون پر اس سے بات بھی کر سکتا ہوں۔ جب تمہیں میرے بھائی کا بھیجا ہوا ڈرافٹ مل جائے تو پھر تم ہمیں حفاظت سے فلوریڈا پہنچانے کے پابند ہو گے۔"

نیگرو کپتان نے مٹھی بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ کاروبار یہ بھی کرتے ہیں۔ اپنے وعدے کے پابند ہوتے ہیں۔ بارباڈوس پہنچ کر تم اپنے بھائی سے فون پر بات کرو گے۔ اوکے؟"

"اوکے۔"

ہم اپنے کیبن میں آ گئے۔ میں نے کرسٹوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"کرسٹوف! یہ حقیقت ہے کہ ہمیں تمہاری وجہ سے آزادی نصیب ہوگی۔ کم از کم میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔"

فلورا بھی اسکا شکریہ ادا کرنے لگی۔ کرسٹوف واقعی کشادہ ظرف آدمی تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"یہ کسی پر احسان کرنے والی بات نہیں ہے۔ میرے بھائی کے پاس بہت دولت ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اگر وہ لاکھ دو لاکھ فرانک میری زندگی بچانے کے لئے خرچ کر دے تو یہ اس کا فرض ہے۔ ایسی دولت کس کام کی اگر وہ کسی مصیبت زدہ کی مدد نہ کر سکے۔"

جہاز میں ہمارے ساتھ وی آئی پی سلوک شروع ہو گیا۔ خانساماں صبح شام چائے اور کھانا لے کر ہمارے کیبن میں آتا۔ تین چار دن سمندر میں سفر کرنے کے بعد جہاز بارباڈوس کی بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر سمندر میں لنگر انداز ہو گیا اور جہاز پر سے وہاں جانے والا سامان اتارا جانے لگا۔ کیپٹن نے ہمیں شام کو اپنے کیبن میں بلا کر کرسٹوف سے کہا۔

"یہاں ہمارا جہاز ایک ہفتہ رکے گا۔ مجھے بتاؤ پیرس میں تمہارے بھائی کا فون نمبر اور ایریا کوڈ کیا ہے اور کیا تمہارا بھائی اس وقت مل جائے گا۔؟"

کرسٹوف بولا۔

"میں خود اس سے بات کروں گا۔ وہ اس وقت کلب میں ہوتا ہے۔"

نیگرو کیپٹن نے فون آگے کر دیا۔ کرسٹوف ڈائریکٹ نمبر ملانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے مطلوبہ نمبر مل گیا۔ وہ فرانسیسی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی سے بات کر رہا ہے۔ بات کرتے ہوئے کئی بار اس کی آواز گلوگیر ہوئی۔ جب اسکی بات ختم ہوئی تو ریسیور رکھ کر کپتان سے کہنے لگا۔

"سر! میں نے ساری بات کر لی ہے۔ آپ کو باربروس کے نیشنل بینک آف فرانس میں دو دن کے بعد ایک لاکھ فرانک کا ڈرافٹ مل جائے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس بینک میں آج ہی اپنا اکاؤنٹ کھلوا لیں۔"

نیگرو کپتان نے بتایا کہ اس کا باربادوس میں اسی بینک میں اکاؤنٹ موجود ہے۔ کرسٹوف نے اسی وقت کیپٹن سے اسکا اکاؤنٹ نمبر لے کر اپنے بھائی کو دوبارا فون کر کے بتایا۔

اب ہمیں دو لاکھ فرانک کے ڈرافٹ کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے بعد ہم لوگ امریکہ حفاظت سے پہنچ سکتے تھے۔ فلورا نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کرسٹوف سے کہا۔

"کہیں یہ کیپٹن ہمیں دھوکا تو نہیں دے جائے گا۔؟"

کرسٹوف نے کہا۔

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ پیشہ ور لوگ ہیں۔ اور کیپٹن نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ یہ کاروبار کرتا ہے۔ ایسے لوگ دھوکا نہیں دیا کرتے۔ اگر وہ دھوکا دینا شروع کر دیں تو ان کا کاروبار ایک دن بھی نہ چلے۔"

اس دوران نیگرو کیپٹن نے ہم تینوں کی پاسپورٹ سائز کی تین فوٹو جہاز ہی میں بنوائیں۔ ہمارے دستخطوں کے ساتھ کچھ کاغذات پر کروائے۔ ایک ہفتے کے بعد نیگرو کیپٹن بڑا خوش خوش ہمارے کیبن میں آیا۔ کہنے لگا۔

"مسٹر کرسٹوف! تمہارے بھائی کا ڈرافٹ مجھے مل گیا ہے۔ اب تم لوگ آزاد شہری کی حیثیت سے امریکہ کی کسی بھی ریاست میں زندگی بسر کر سکتے ہو۔ کل تمہیں تمہارے پاسپورٹ وغیرہ مل جائیں گے۔"

جب وہ چلا گیا تو ہم آپس میں بیٹھ کر پروگرام بنانے لگے کہ امریکہ پہنچ کر کس کو کہاں جانا ہو گا۔ کرسٹوف کہنے لگا۔

"میں فرانس واپس نہیں جا سکتا کیونکہ وہاں پہنچتے ہی پولیس مجھے پھر گرفتار کر لے گی۔ میں فلوریڈا سے تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ میرا ارادہ ہے میں میکسیکو جا کر آباد ہو جاؤں۔ وہاں میں محفوظ ہوں گا۔"

فلورا نے کہا۔

"میں تو میامی میں ہی رہوں گی۔ امریکہ میں مجھ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔ فرانس کے سفارت خانے والے امریکہ میں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

فلورا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس نے جب مجھ سے پوچھا کہ میرا آگے کا کیا پروگرام ہے تو میں نے کہا۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے تو میں واشنگٹن جاؤں گا۔ وہاں سے نیویارک چلا جاؤں گا۔ وہاں جا کر سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے میں اپنے ملک واپس چلا جاؤں۔ لیکن میں جہاز کے کپتان کے بنوائے ہوئے جعلی پاسپورٹ پر واپس نہیں جاؤں گا۔ واشنگٹن میں میرے دوست کے پاس میرا پاسپورٹ محفوظ ہے۔ اگر نہ ہوا تو میں پاکستانی سفارتخانے کے تعاون سے دوسرا پاسپورٹ بنوا لوں گا۔"

پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو اپنا پاسپورٹ ساتھ لے کر سانگوش کے پاس برازیلیا آیا تھا۔ میرا پاسپورٹ تو سانگوش کے پاس ہی پڑا ہو گا۔ میں نے یہی سوچا کہ نیویارک پہنچ کر میں سانگوش کو خط لکھ کر اپنا پاکستانی پاسپورٹ منگوا لوں گا۔

کرسٹوف کہنے لگا:

"باربادوس ویسٹ انڈیز کا شہر ہے اور اس وقت ہم اسی شہر کے سمندر میں لنگر انداز ہیں۔ یہاں سے جہاز ناساؤ جائے گا جو جزائر لباماز میں ہے۔ یہ کافی لمبا سفر ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ کیپٹن ہمیں فلوریڈا پہنچا دے گا۔ اگر دیکھا جائے تو ابھی ہم خطرے سے زیادہ دور نہیں ہوئے۔ ہمارا جہاز فرنچ گیانا سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

فلورا پریشان ہو گئی۔

"کہیں پولیس جہاز پر ہماری تلاش میں نہ آ جائے؟"

کرسٹوف نے کہا: "کیپٹن نے ہماری حفاظت کی ذمے داری لی ہے۔ اگر ایسی بات ہو بھی گئی تو وہ ہمیں کہیں چھپادے گا۔ مال بردار جہاز میں چھپنے کی بہت جگہیں ہوتی ہیں۔"

فلورا نے جس خطرے کا اظہار کیا تھا' وہ ہوکر رہا۔ جہاز کو باربردوس کی بندر گاہ سے دور سمندر میں کھڑے پانچواں دن تھا اور اس پر ناساؤ جانے والا سامان لادا جارہا تھا کہ اچانک نیگرو کیپٹن ہمارے کیبن میں آیا۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ چٹکی بجاکر بولا:

"جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ جلدی"

وہ ہمیں جہاز کے سب سے نچلے حصے میں لے گیا اور ایک ایسے کیبن میں بند کرکے باہر سے تالا لگادیا جس میں دنیا جہان کا کباڑ بھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ جہاز پر ٹ انڈیز کی پولیس ہماری تلاش میں پہنچ گئی ہے اور وہ جہاز کی تلاشی لے رہی تھی۔ ہم تین چار گھنٹے اس کباڑ خانے میں بند رہے۔ پھر کہیں جاکر نیگرو کیپٹن نے ہمیں باہر نکالا۔ وہ ہمیں واپس ہمارے کیبن میں لے آیا۔ کہنے لگا:

"فرنچ گیانا کی پولیس نے باربادوس کی پولیس سے خاص طور پر تعاون کی درخواست کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے تین قیدی جیل سے فرار ہوگئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی بحری جہاز میں سفر کررہے ہیں۔ چنانچہ باربادوس کی پولیس اس جہاز پر بھی آگئی تھی۔ مگر سب خیریت رہی۔ میں نے تھوڑی بہت تلاشی بھی کروائی اور تھوڑی بہت رشوت بھی دے دی ہے۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی ہم کل رات کو یہاں سے روانہ ہورہے ہیں۔"

ہم نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ مصیبت ٹل گئی۔

اگلے روز شام کو مال بردار جہاز نے باربادوس کی بندر گاہ سے لنگر اٹھایا اور جزائر لباماز کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب خطرہ ہم سے دور ہوتا جارہا تھا۔ یہ بڑا لمبا سفر تھا۔

راستے میں جہاز کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں پر رکا۔ وہاں سے مال لیا' دیا اور آگے روانہ ہوگیا۔ اس طرح ہم کوئی بیس بائیس دن کے سمندری سفر کے بعد آخر کار لباماز کی اہم بندر گاہ ناساؤ پہنچے۔ ہم امریکہ کے بہت قریب آگئے تھے۔ وہاں سے سوڈیڑھ سو میل کے سمندری فاصلے پر امریکی ریاست فلوریڈا کا ساحل شروع ہوتا تھا۔ ناساؤ پہنچنے کے بعد کیپٹن نے اپنے اثر و رسوخ سے ہم تینوں کے نقلی پاسپورٹ تیار کروالئے۔ ان پر امریکہ سے برازیل اور برازیل سے واپسی کے ویزے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ یہ امریکی پاسپورٹ تھے۔ ان پر ہماری تصویریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ ہم پاسپورٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہر چیز ہو بہو اصلی لگ رہی تھی۔ نیگرو کیپٹن نے کہا:

"میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے۔ اب صرف تمہیں یہاں سے ایک عام مسافر بردار جہاز میں فلوریڈا کی بندر گاہ تک جانا ہوگا۔ وہاں تمہارے کاغذات چیک ہوں گے اور تم بڑی آسانی سے امریکہ پہنچ جاؤ گے۔"

ہمیں یہ ڈر ضرور تھا کہ کہیں میامی کی بندر گاہ پر ہمارے پاسپورٹ کا فراڈ نہ کھل جائے۔ مگر یہ خطرہ تو ہمیں ہر حال میں مول لینا ہی تھا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم غیر قانونی طور پر کوسٹ گارڈز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فلوریڈا کی خلیج عبور نہیں کرسکتے تھے۔

نیگرو کپتان نے ہمیں الوداع کہا۔ تحفے کے طور پر مجھے' کرسٹوف اور فلورا کو نئے کپڑے دیئے جو ہم نے وہیں پہن لئے۔ ہماری حالت پہلے سے بہت بہتر ہوگئی تھی۔ جہاز میں نیگرو کیپٹن کی مہمان نوازی نے ہماری صحت بحال کردی تھی۔ ہم ایک مسافر بردار جہاز میں سوار ہوگئے۔ جیٹی پر کسٹم والوں نے ہمارے کاغذات چیک کئے جو بالکل درست نکلے۔ انہیں ہمارے پاسپورٹ پر ذرا سا بھی شک نہ ہوا۔ جہاز ناساؤ کی

بندر گاہ سے روانہ ہو کر کوئی تین گھنٹے کے بعد امریکی ریاست فلوریڈا کی بندر گاہ میامی پہنچ گیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔

میامی کی روشنیاں دیکھ کر فلورا کے چہرے پر رونق آگئی۔ کہنے لگی:

"میں آج جتنی خوش ہوں پہلے اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لگتا ہے میں نے نیا جنم لیا ہے۔"

بندر گاہ کے کسٹم کاؤنٹر پر جب ہمارے کاغذات چیک ہو رہے تھے تو میرے دل کی دھڑکن تھوڑی تیز ہو گئی تھی۔ مگر نیگرو کیپٹن نے جس شخص سے یہ نقلی پاسپورٹ بنوائے تھے' اس نے بھی کمال کر دیا تھا۔ کسٹم والوں کو ذرا سا بھی شک نہ پڑا۔ انہوں نے ہمیں پاسپورٹ واپس کر دیئے اور جب ہم میامی کی بندر گاہ سے باہر سڑک پر آئے تو ہمارے سامنے روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ گاڑیاں کشادہ ترین سڑک پر چل رہی تھیں اور دور دور تک رنگین نیون سائن کے بورڈ جھلمل کر رہے تھے تو یقین کریں مجھے واقعی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں جہنم سے نکل کر بہشت ارضی میں آگیا ہوں۔

نیگرو کیپٹن نے ہمیں تھوڑے سے ڈالر دے دیئے تھے۔ فلورا ہمیں اپنے فلیٹ پر لے گئی۔ اتنی دیر بعد اس کے فلیٹ میں فرنیچر وغیرہ پر گرد کی ہلکی ہلکی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے ہمارے لئے بازار سے گروسری لا کر کھانا تیار کیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ کافی پی اور سکون سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ہم نے واقعی بہت بڑا معرکہ مارا تھا۔ دوسرے دن کرسٹوف ہم سے جدا ہو گیا۔ اسے میکسیکو جانا تھا۔ اب میں اور فلورا اکیلے رہ گئے تھے۔ فلورا نے ایک دوسری جگہ نوکری شروع کر دی۔ میں اب واپس واشنگٹن روانہ ہونا چاہتا تھا۔ مگر میرے پاس ہوائی جہاز کا کرایہ نہیں تھا۔ فلورا کہنے لگی:

"تم میرے پاس کیوں نہیں رک جاتے۔ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے؟"

ہم لیونگ روم میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میرا بیئر کا گلاس تپائی پر میری دائیں جانب پڑا تھا۔ میں نے فلورا کا ہاتھ آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں پسند کرتا ہوں فلورا۔ مگر میری کچھ مجبوریاں بھی ہیں۔ میں شادی شدہ ہوں۔ پاکستان میں میری فیملی میری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ میں نے ایک مدت سے انہیں کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ کل میں انہیں خط لکھ کر پوسٹ کر رہا ہوں۔"

فلورا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ٹی وی دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر افسردگی سی چھا رہی تھی۔ میں نے کہا:

"لیکن فلورا' یقین کرو۔ میں جہاں بھی ہوں گا' تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔ تمہارے ساتھ گذارے ہوئے خوشی اور مصیبت کے دن میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ کسی سٹور میں ایک مہینے کے لئے جاب کر لوں۔ تاکہ میں واشنگٹن کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید سکوں۔"

فلورا نے میری طرف دیکھا اور کہا:

"کیا تم مجھے اپنی دوست نہیں سمجھتے؟"

"کیوں نہیں سمجھتا۔"

"تو پھر تمہیں جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تمہیں جانا ہی ہے تو میں تمہیں ٹکٹ خرید دوں گی۔ قسطوں پر ایئر ٹکٹ مل جائے گا۔ میں قسطیں ادا کر دوں گی۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ مگر میں چاہوں گی کہ تم کم از کم دو ہفتے میرے ساتھ گذار دو۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے۔ میں دو ہفتے تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

دوسرے ہی روز میں نے پاکستان میں اپنی فیملی کو خط لکھ کر انہیں اپنی خیریت کی اطلاع دے دی اور لکھا کہ میں چند روز بعد پاکستان واپس پہنچ رہا ہوں۔ فلورا کے ساتھ دو ہفتے بڑی جلدی گذر گئے۔ اس سے جدا ہونے کا وقت آگیا۔ میامی ایئر پورٹ پر اس سے الگ ہونے کا منظر بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ مجھے اس لڑکی سے واقعی محبت ہوگئی تھی۔ لیکن میں اس محبت کی صرف یادیں۔۔۔۔ خوشگوار یادیں۔۔۔ افسردہ کر دینے والی یادیں ہی ساتھ لے جاسکتا تھا۔ یورپ امریکہ کی لڑکیوں میں ایک بات میں نے خاص طور پر دیکھی ہے کہ اگر محبت ہو جائے تو بھی وہ بڑے آرام سے جدا ہو جاتی ہیں۔ فلورا بھی مجھ سے آخری بار ہاتھ ملاتے وقت مسکرا رہی تھی۔ لیکن جب میں چلا تو میں نے اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک خاموش اداسی کو دیکھا تھا۔ یہ خاموش اداسی آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

میں طیارے میں سوار ہو گیا۔ اور طیارہ واشنگٹن کی طرف پرواز کر گیا۔ واشنگٹن پہنچ کر میں سیدھا اپنے بچپن کے دوست کے فلیٹ پر آگیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا:

"تم آدمی ہو یا چھلاوہ؟ غائب کیا ہو گئے کہ واپس مڑ کر نہیں دیکھا۔۔۔"

اسے ساری کہانی سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کے فلیٹ سے برازیلیا میں سانگوش کو ٹیلی فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر بولا:

"تم کہاں تھے؟ کہاں سے بول رہے ہو؟ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

میں نے اسے مختصراً اپنی روئیداد سنائی اور کہا کہ پہلی ڈاک میں مجھے میرا پاکستانی پاسپورٹ بھیج دو۔ میں نے اسے اپنے دوست کے فلیٹ کا ایڈریس لکھوا دیا۔ تین دن بعد مجھے میرا پاسپورٹ مل گیا۔ میں نے مال بردار جہاز کے کپتان کا بنوا کر دیا ہوا جعلی پاسپورٹ وہیں ضائع کر دیا اور پاکستانی پاسپورٹ اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔

لیا۔ اس پر میرے ویزے کی درج مدت گذر چکی تھی۔ میں نے امریکہ میں دی گئی مدت سے زیادہ قیام کیا تھا۔ لیکن اگر آپ ویزے کی مدت سے زیادہ دن بھی امریکہ میں ٹھہر جائیں اور جب واپس جا رہے ہوں تو ایئر پورٹ پر کسٹم والے آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ مجھے معلوم تھا۔ وہ اس بات سے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ چلو یہ شخص یہاں سے واپس تو جا رہا ہے۔ ان کے لئے یہی بڑی غنیمت ہوتی ہے۔ میں واشنگٹن میں اپنے اس پاکستانی مہربان سے بھی نہیں ملا جس نے مجھے دولت کا لالچ دے کر برازیلیا بھیجا تھا بلکہ میں خود ہی دولت کے لالچ میں آگیا تھا۔ اس میں اس آدمی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے نیویارک جانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا اور پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میرے دوست نے مجھے واشنگٹن سے لاہور تک کا ایئر ٹکٹ لے کر دے دیا۔ امریکہ میں بڑی آسان قسطوں پر ایئر ٹکٹ مل جاتا ہے اور ڈالروں کے حساب سے کوئی مہنگا نہیں ہوتا۔

امریکہ سے رخصت ہونے کا وقت بھی آگیا۔

میرے دوست نے کہا:

"یار تم خود ہی ٹیکسی لے کر ڈیلس ایئر پورٹ پر چلے جانا۔ میرے پاس تمہیں چھوڑنے کے لئے بالکل وقت نہیں ہے۔"

میں نے بالکل برا نہ مانا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ امریکہ میں رہنے والوں کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر نعمت ہوتی ہے۔ صرف وقت نہیں ہوتا۔ میری فلائٹ صبح سات بجے کی تھی۔ میں ساڑھے پانچ بجے ٹیکسی لے کر ڈیلس ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سامان میرے پاس بالکل نہیں تھا۔ وہی ایک بریف کیس تھا جس کو ساتھ لے کر میں پاکستان سے آیا تھا۔ ڈیلس ایئر پورٹ ورجینیا کے علاقے سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔

میں آدھ گھنٹے پہلے ایئرپورٹ آگیا تھا۔ ٹکٹ میرے پاس تھا۔ میں ایک بار شاپ میں آکر بیٹھ گیا۔ میں نے بیئر کا ایک ٹن لے لیا اور سگریٹ سلگا کر گذرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا کہ مجھے اس سفر میں کیسے کیسے حالات سے گزرنا پڑا تھا۔ میں بڑا خوش بھی تھا کہ اپنے وطن پاکستان واپس جارہا تھا۔ میری فلائیٹ کا وقت قریب آرہا تھا۔ میں اٹھ کر بڑے ہال میں آگیا۔ کاؤنٹر پر جہاں میری فلائیٹ کا نمبر لکھا تھا' وہاں سے بورڈنگ کارڈ بنوایا۔ بریف کیس کو ٹیگ لگایا اور ڈیپارچر لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔ فلائیٹ کی روانگی کا اعلان ہوا تو میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ گیٹ میں سے گذر کر بس میں سوار ہوکر طیارے کی طرف روانہ ہوا جو وہاں سے دور کھڑا تھا۔ یہ پین ایم کا جمبو جیٹ طیارہ تھا۔ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ مسافر قطار میں چلے جارہے تھے۔ جہاز کے دروازے کی دونوں جانب دو ایئرہوسٹسیں کھڑی تھیں۔ میں جہاز میں داخل ہوکر اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔ ٹھیک وقت پر جہاز ٹیک آف کر گیا۔ آہستہ آہستہ جہاز بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر اس کی رفتار ہموار ہوگئی۔ میری ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ حسب عادت میں نے کھڑکی والی سیٹ لی تھی۔ میں کھڑکی کے شیشے میں سے باہر تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک خاص قسم کی پرفیوم کی خوشبو محسوس ہوئی۔ پھر آہستہ سے کسی عورت نے میرا نام لے کر مجھے بلایا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری ساتھ والی سیٹ پر گارشیا یا گارشیا کی روح بیٹھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے بڑی میٹھی آواز میں کہا:

"تم اپنے وطن جارہے ہو۔ سوچا تمہیں مل لوں۔۔۔۔"

میں نے آہستہ سے کہا:

"میں تو تمہیں ملنے تمہارے پرانے کاٹج میں بھی گیا تھا۔ مگر تم نہ ملیں۔ شاید تم مجھ سے ناراض ہو۔"

گارشیا میری طرف اپنی ٹرانسپیرنٹ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی:

"ہم روحیں کسی سے ناراض نہیں ہوا کرتیں۔ روحوں پر غم اور خوشی کی حقیقت کا انکشاف ہوچکا ہوتا ہے۔ میں نے کبھی تمہیں پیشکش کی تھی کہ اگر تم مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کرلو تو میں جسمانی شکل میں تمہارے پاس آجاؤں گی۔ لیکن یہ ایک گناہ تھا جو مجھ سے سرزد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ لیکن چونکہ میں گناہ کا ارادہ کرچکی تھی' اس لئے مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔ تمہارے ساتھ میرا ایک دلی رابطہ قائم ہوچکا ہے۔ اگر یہ رابطہ نہ ہوتا تو شاید میں تمہارے پاس کبھی نہ آتی۔"

اتنے میں ایک ایئرہوسٹس ٹرالی چلاتی ہمارے قریب آرہی تھی۔ میں نے گارشیا سے کہا:

"خاموش ہوجاؤ۔ وہ تمہاری باتیں سن لے گی۔"

گارشیا نے کہا:۔"وہ نہ میری آواز سن سکتی ہے نہ مجھے دیکھ سکتی ہے۔ صرف تم مت بولنا' نہیں تو وہ تمہیں دیوانہ سمجھے گی جو اپنے آپ سے باتیں کررہا ہے۔"

میں چپ ہوگیا۔ ایئرہوسٹس آگے نکل گئی۔ گارشیا کہنے لگی:

"میں تمہیں صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ اپنے دل سے بغیر محنت کئے دولت حاصل کرنے کا خیال ہمیشہ کے لئے نکال دو۔ اپنے ملک میں جاکر اپنے ملک کے لئے جتنا بھی تعمیری کام کرسکتے ہو' کرتے رہو۔ رات کی تاریکی میں جلتا ہوا ننھا سا چراغ رات کو دن کبھی نہیں بنا سکتا۔ لیکن وہ اپنی کمزور اور معمولی سی روشنی سے بھولے بھٹکے مسافروں کو اندھیرے میں راستہ ضرور دکھا سکتا ہے۔ تم بھی چراغ بن کر بھولے بھٹکوں کی راہ نمائی کرو۔ تمہارے ملک کو تمہارے گھر والوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ تمہاری ذمے داریاں ہیں' ان ذمے داریوں کو پوری توجہ سے نبھاؤ۔ یہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ زندگی اور کائنات کے راز معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تم صرف

یہ راز معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ تم پر اپنے ملک اپنے بیوی بچوں اور اپنے معاشرے کی کون کون سی ذمے داریاں ہیں۔ جب تمہیں معلوم ہو جائے تو ان ذمے داریوں کو پورا کرنے میں لگ جاؤ۔ باقی سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہوتا جائے گا۔ زندگی میں دولت کا لالچ کبھی نہ کرنا۔ اگر دولت مل بھی جائے تو اس سے پیار کبھی نہ کرنا۔ اب میں جاتی ہوں۔ بس۔ میں تمہیں صرف یہی کہنے آئی تھی۔"

میں بڑی توجہ سے گارشیا کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا:

"کیا تم مجھے لاہور ملنے آؤ گی؟"

گارشیا نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا:

"یاد رکھو دنیا کی کوئی عورت خواہ وہ مونالیزا، قلوپطرہ اور ہیلن آف ٹرائے ہی کیوں نہ ہو، تمہارے ضمیر کو سکون اور تمہاری روح کو وہ خوشی نہیں دے سکتی جو تمہاری بیوی تمہیں دے سکتی ہے۔ جس کام میں تمہارا ضمیر بے چینی محسوس کرے، وہ کام چھوڑ دو۔ تمہارے اندر ایک نور کا جسم ہے۔ اس جسم کو اپنے گناہوں سے آلودہ نہ کرو۔ یہ نور کا جسم تمہارے سارے گناہ لے کر اوپر جائے گا۔ تم خدا کو مانو، چاہے نہ مانو، مگر گناہ کرنے کے بعد تم ضمیر کی خلش اور خدا کی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ میں چاہے لاہور آؤں یا نہ آؤں۔ تم لاہور میں رہ کر اپنے بچوں کی صحیح پرورش کرتے رہنا۔ کوشش کرنا کہ وہ بڑے ہو کر تم سے بہتر انسان بنیں۔ اگر تمہارے جیسے بھی ہوئے تو کوئی فائدہ نہیں۔ ایک پتھر اپنی جگہ سے ہٹے گا، دوسرا پتھر اس کی جگہ لے لے گا۔ تم سے بدتر ہوئے تو یہ بہت بڑے عذاب کی بات ہوگی۔ انہیں اپنے سے بہتر بنانا۔ تاکہ انسان ہونے کے ناطے بچہ پیدا کرنے کا حق ادا کر سکو۔ خدا حافظ! اب شاید اگلے جہان میں ملاقات ہو۔۔۔۔!"

گارشیا کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ تھی۔ وہ میری ساتھ والی سیٹ پر سے اٹھی۔ طیارے کی کھڑکی کے شیشے کے پاس آئی اور طیارے سے باہر نکل گئی۔ میں شیشے میں سے اسے سفید بادلوں سے بھی اوپر نیلے آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔